سلسلۂ مطبوعات
برکات بکڈپو Barakaath Book Depot
۶۸

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

کی تمام مسلمانوں کے لئے

چالیس نصیحتیں



تشریح وتوضیح

حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب دامت برکاتہم
ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

ناشر
برکات بکڈپو Barakaath Book Depot و ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

کی تمام مسلمانوں کے لئے

چالیس نصیحتیں

تشریح وتوضیح

حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب دامت برکاتہم

ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

سلسلۂ مطبوعات ۶۸

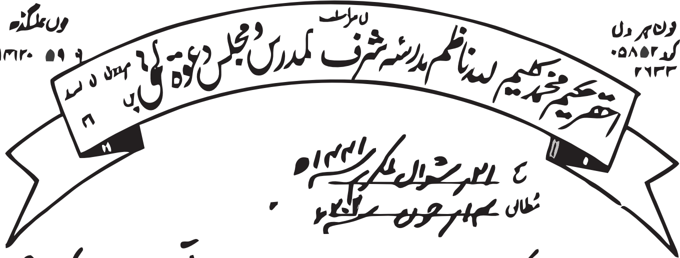
ناشر

برکات بکڈپو Barakaath Book Depot و ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

تقریظ گرامی: محسنی و مشفقی طبیبُ الامت حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ العالی

خلیفہ وجانشین حضرت محی السنہ شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ

باسمہٖ تعالیٰ



عزیز مکرم مولوی محمد تقوی صاحب سلمہٗ ربہ مصلحاً و مرشداً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا رسالہ عزیزم عبد المقیط سلمہٗ کے ذریعہ ملا
مقدمہ حرف بحرف سنا اور مضامین چیدہ چیدہ سنے
بہت جی خوش ہوا اور آپ کیلئے دل سے دعا نکلی
آپ نے حکیم الامت مجدد الملت حضرت والا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے
نصائح کی بہت ہی عمدہ تشریح فرمائی ہے
صمیم قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی سعی کو
قبول فرمائے امت کیلئے نافع بنائے اور آپ کو
مزید ترقیات سے نوازے

والسلام
کلیم اللہ عفی عنہ

تقریظ گرامی: معظمی و مرشدی حضرت مولانا مفتی **سعید احمد** صاحب مدظلہ العالی پرنام بٹ

خلیفہ محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ

بندہ سعید احمد غفرلہ
پرنام بٹ

23, Mullah S reet,
PERNAMBUT-635 810.

باسمہ تعالیٰ شانہ

مکرمی و محبی جناب مولانا محمد عبد القوی صاحب زید لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ آپ کے مرتبہ رسالہ کا مسودہ موصول ہوا بالاستیعاب مطالعہ تو نہ ہو سکا تاہم جہاں جہاں دیکھا الحمد للہ مفید پایا۔

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کے بعض افادات کی تسہیل و تشریح کا کام اس سے قبل بھی آپ نے کیا ہے جو ماشاء اللہ نافع و مقبول ثابت ہوئے تھے اللہ تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ یہ رسالہ بھی آپکی دیگر کتب کی طرح ان شاء اللہ علمی و عوامی حلقوں میں مقبول و منظور ہوگا اور امت مسلمہ کیلئے کثیر افادہ کا باعث بنے گا - ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم آمین

والسلام

بندہ سعید احمد غفرلہ

۱۵ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ

تقریظ گرامی: برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد عبدالمغنی صاحب مظاہری مدظلہ خلیفہ حضرت محی السنہ شاہ ابرارالحق صاحب رحمہ اللہ

MUFTI
MOHAMMED ABDUL MUGHNI
MAZAHERI
Principal: Madrasa Sabeelul Falah Hyd.
President: City Jamiat Ulama Hyd.

مفتی محمد عبدالمغنی مظاہری
ناظم مدرسہ سبیل الفلاح حیدرآباد
صدر سٹی جمعیۃ علماء حیدرآباد

22-8-61 To 107, Lakkadkot, Chatta Bazar, Hyd. - 02 | Bandlaguda, Chandrayangutta, Hyd. - 05 (T.S.) | Ph. 9246341893 / 9440736100.

Ref...　　　　تاریخ Date:......................

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ اما بعد!

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ اپنے وقت کے محقق عالم دین، فقیہ ومجتہد اور مجدد ہونے کے ساتھ ساتھ شیخ طریقت اور مرشد کامل بھی تھے، ان کی تصنیفات وتالیفات، اور مواعظ وملفوظات میں علوم ومعارف کی گراں قدر موتیاں، اخلاق واحسان کے جواہر پارے، تصوف وطریقت کے انمول خزانے پائے جاتے ہیں، ہر ایک ملفوظ سے اصلاح امت کے لئے ان کا دردِ دل بھی جھلکتا ہے۔

اسی اصلاح امت کی فکروں میں ۴۰ رنصیحتوں پر مشتمل وہ مضمون بھی ہے جو بہشتی زیور کے ساتویں حصے میں درج ہے، جس میں دین اور دنیا کی اہم باتیں اور ہدایتیں شامل ہیں، جس کا عنوان ''ہر مسلمان کو رات دن اس طرح رہنا چاہئے'' ہے۔ محی السنہؒ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب نور اللہ مرقدہٗ ـــــ جن کی حیاتِ مبارکہ حکیم الامت ومجدد الملت کی تعلیمات کا عملی نمونہ تھی ـــــ کی ہدایت پر دعوۃ الحق کے مدارس میں یہ مجموعہ طلبہ کرام کو زبانی یاد دلایا جاتا ہے، جس کی برکت سے طلبہ کی علمی وروحانی تربیت بھی ہوتی ہے۔

میری خواہش تھی کہ ان زرین نصیحتوں کو قرآنی آیات اور متعلقہ احادیثِ مبارکہ کے ذریعہ واضح اور مدلل کیا جانا چاہئے تاکہ عوام وخواص کو بھرپور فائدہ ہوسکے۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے۔ عزیزم وبرادرم مولانا حافظ محمد عبدالقوی صاحب سلمہ وزید مجدہ کو انہوں نے حضرت حکیم الامت، مجدد الملتؒ کی ترجمانی کرتے ہوئے اس ضروری اور علمی خدمت کو بہتر طریقے پر انجام دیا ہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء واحسنہٗ۔

مدارس میں طلبہ کے درمیان، خانقاہوں میں سالکین کے درمیان، مسجدوں میں نمازیوں کے درمیان اور گھروں میں متعلقین کے درمیان روزانہ ایک ایک نصیحت اور اس کی تشریح کا معمول بنالیا جائے تو امید ہے کہ عوام وخواص کو بے انتہاء، روحانی، سماجی فائدہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس علمی خدمت کو قبول فرمائے اور عوام وخواص کو استفادہ کی توفیق مرحمت فرمائے۔

والسلام

۱۴۴۱/۱۱/۳۰ھ م ۲۰۲۰/۶/۲۵ء

پیش گفتار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد!

حکیمُ الامت، مجدد الملت، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ چودھویں صدی ہجری میں غیر منقسم ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت تھے؛ انہوں نے ۱۲۸۰ھ میں اس عالمِ رنگ و بو میں قدم رکھا اور ۱۳۶۲ھ کے اواخر میں اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ فرمایا، جملہ ۸۲ برس کی زندگی پائی، ان بیاسی برسوں میں سے اُنیس برس بچپن اور تعلیم و تعلم میں نکل گئے کیوں کہ ۱۲۹۹ھ میں دار العلوم دیو بند سے فارغ ہوئے اور اُس وقت کے نابغۂ روزگار شخصیات سے علومِ ظاہرہ کی تکمیل فرمائی، باقی ترسٹھ سال پورے کے پورے دین کی خدمت میں گذار دیئے، کیوں کہ فراغت معاً بعد کان پور شہر کے مشہور مدرسہ جامع العلوم میں تدریس اور اطراف و اکناف میں تبلیغ کا سلسلہ شروع فرما دیا تھا۔

۱۳۰۱ھ میں حج کے لئے تشریف لے گئے، حرمین شریفین کی حاضری اور وہاں کی بے پناہ نورانیت و روحانیت سے فیض یاب ہونے کے علاوہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کی صحبت و معیت سے بھی خوب استفادہ کیا، یہاں تک کہ انہوں نے اس ہونہار اور باکمال مُرید کی روحانیت کو ترقّی کی بلندیوں پر محسوس کرتے ہوئے چاروں سلاسلِ تصوُّف میں اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا، نہ صرف خلافت بلکہ اپنی ہجرت اور رفقاء کی شہادت کے بعد بے فیض و خاموش پڑی اپنی خانقاہ و فیض گاہِ تھانہ بھون موسوم بہ ''دکّانِ معرفت'' کی نیابت بھی عطا فرمائی اور بہت بہ جا فرمائی۔

حکیم الامتؒ نے اپنے شیخ کی اس ہدایت کی تکمیل کرنے کے لئے شہر کان پور کی شہرۂ مُلک درس گاہ ''جامع العلوم'' کی علمی و تدریسی مشغولیات کو خیر باد کہتے ہوئے اپنے وطن اور شیخ کی قیام گاہ تھانہ بھون کی ایک بہت چھوٹی مگر بہت ہی بابرکت مسجد میں علومِ ظاہرہ اور فیوضِ باطنہ کی نشر و اشاعت کا کام شروع فرما دیا۔

شیخِ وقت کی توجہات اور مُریدِ باصفا و باوفا کی مخلصانہ ذات نے حق تعالیٰ شانہ کی توفیق و تقدیر سے ایک چھوٹے سے پس ماندہ دیہات اور ایک چھوٹی سی مگر تاریخی مسجد میں وہ کشش و مقناطیسیت پیدا کی کہ ہندوستان کے طول و عرض سے لوگ کھچے کھچے چلے آئے، تاریخ گواہ ہے کہ جو آیا وہ ذرّہ سے آفتاب بن کر ہی گیا، خانقاہِ تھانہ بھون سے علم و تحقیق، تصنیف و تالیف، وعظ و نصیحت، فقہ و فتویٰ، معرفتِ الٰہی اور اصلاح و تربیت کا کون سا کام ہے جو نہ ہوا تھا، واقعی وہ اپنی ذات میں انجمن اور شخصیت میں ایک جہاں تھے: رمزی اٹاوی نے بالکل صحیح کہا تھا۔

مُفسر، محدث، مجتہد، عالم، حافظ و قاری

بایں اوصاف شُہرت سے بری اظہار سے عاری

واقعہ یہ ہے کہ مسلک و مشربِ دیوبند کی صحیح ترجُمانی اور وضاحت و اشاعت کا کام حکیمُ الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے جلیلُ القدر اور وسیع العلم خلفاء کے ذریعہ جتنا ہوا وہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو کسی اور سے نہ ہو سکا، ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ

آپ رحمۃ اللہ علیہ اُمت کے خواص و عوام سب کی صلاح و فلاح کے لئے ہر وقت بے چین رہتے تھے، اسی بے چینی نے آپ سے سیکڑوں کی تعداد میں نہایت اہم موضوعات پر تصنیفی کام کروایا، ہزاروں فتاویٰ جاری کروائے، ہزاروں وعظ اور ملفوظات کہلوائے جو بفضلہٖ تعالیٰ سب کے سب محفوظ اور مراجعِ عام و خاص ہیں، ایک کتاب آپ نے بالخصوص مسلم خواتین کی ضروری تعلیم و تربیت کے لئے ''بہشتی زیور'' کے نام سے مُرتب فرمائی تھی، جس سے بلاشبہ لاکھوں خواتین کی زندگیاں خوش اعتقادی اور حُسنِ عمل کا مظہر بنیں، معاملات و معاشرت میں نکھار اور تہذیب میں سُدھار آیا، اسی کتاب کے ساتویں حصے میں ''مُریدوں بلکہ تمام مسلمانوں کو

اس طرح رہنا چاہیئے'' کے عنوان سے دین کی چالیس اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

راقم السطور کو اپنے بڑوں کی بہ دولت بچپن ہی میں ان باتوں کو یاد کرنے کی توفیق ملی جو عمر کے ہر حصّے میں کام آتے رہے، بلکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوتا رہا، جی چاہتا تھا کہ ان کارآمد اور نہایت مفید دینی باتوں کو قدرے تشریح کے ساتھ مرتب کردوں تاکہ بہ طور نصاب کے طالبانِ تربیت اور سالکانِ راہِ خدا کو پڑھایا جائے اور عمل کا پابند بنایا جائے، چناں چہ کئی مرتبہ یہ کام شروع کیا، کبھی بہت طویل ہوجانے کی وجہ سے روک دیا اور کبھی نامکمل رہ کر ضائع ہوگیا، لیکن اس مرتبہ داعیہ اس قدر شدید ہوا کہ ایک سفر کے دوران ائیر پورٹ ہی پر ایک نوٹ بک خرید کر دورانِ سفر ہی کئی نمبرات کا کام کرلیا اور واپسی کے بعد ترجیحی طور پر توجہ دے کے اس کا کام بتوفیق اللہ تعالیٰ مکمل کرلیا۔

میں نہایت ممنون و مشکور ہوں مخدومی و محسنی حضرت اقدس حکیم کلیمُ اللہ صاحب مدظلہٗ العالی کا کہ میں نے لاک ڈاؤن کی وجہ سے واٹس ایپ کے ذریعہ رسالہ بھیج کر تقریظ کی گذارش کی تو حضرت والا نے پہلے مختصراً سُن کر تقریظ اور دعاؤں سے نوازا، پھر اپنی مبارک مجالس میں حاضرین کو تھوڑا تھوڑا کرکے یہ رسالہ مکمل سُنایا، میرے لئے اس سے بڑھ کر اطمینان اور سعادت کی کیا بات ہوسکتی تھی؟ حق تعالیٰ ان کا سایۂ شفقت ہم خدام پر صحت و سلامتی کے ساتھ تادیر قائم رکھیں، آمین۔

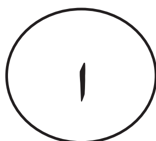
حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ صاحبِ نصائح کے اخلاص اور اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا افضل الصلوات وازکی التحیات کے تئیں سوز دروں کی برکت سے اس رسالے کو اُمت کے حق میں نافع اور راقمِ سطور کی مغفرت کا وسیلہ بنائے۔ آمین۔ والصلوٰۃ علی النبی الکریم

محمد عبدالقوی غفرلہ

۱۱ ر شوال المکرم ۱۴۴۱ھ

شبِ یکشنبہ، دورانِ لاک ڈاؤن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



ضرورت کے موافق دین کا علم حاصل کرنا؛ خواہ کتاب پڑھ کر یا عالموں سے پوچھ پاچھ کر!

علم دین حاصل کرنے کو نمبر ایک پر اس لئے رکھا کہ علم کے ذریعہ ہی عمل کی صحیح صورت اور ہر کام کا پسندیدہ طریقہ معلوم ہوتا ہے، علم ہی نہ ہو تو آدمی یا تو وہ کام کرے گا ہی نہیں اور اگر کرے گا تو اس کا پتہ نہیں ہوگا کہ معتبر و مقبول ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے بندوں کو کوئی کام کرنے کا حکم دیا ہے وہیں اُس کے کرنے کا بہتر اور پسندیدہ طریقہ بھی بتلایا ہے، اب ایک آدمی کو مثلاً نماز پڑھنا ضروری ہونے کا علم نہیں ہے تو وہ نماز پڑھے گا ہی نہیں، اور اگر اس کا علم تو ہے مگر اس کے پڑھنے کے مسنون و مقبول طریقے کا علم نہیں ہے تو پڑھے گا مگر اپنی عقل سے یا دوسروں کی دیکھا دیکھی پڑھے گا، ایسی نماز ضروری نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول بھی ہو، اور اگر قبول نہ ہوئی تو پھر محنت بھی گئی ثواب بھی نہ ملا، ایسے پڑھنے سے فائدہ کیا ہوا؟ اس لئے ایک مسلمان کے لئے سب سے مقدم اور سب سے اہم کام جو ہے وہ علم دین حاصل کرنے کا کام ہے؛ اسی وجہ سے حضرتؒ نے پہلی بات جو مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دی وہ ''علم دین کا حاصل کرنا'' ہے۔

قرآن وحدیث ــــ جو ہمارے دین کا اصل سرچشمہ ہیں ــــ میں دین کا علم حاصل کرنے کی بہت سخت تاکید کی گئی ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ﴿۵﴾ (سورۃ العلق: ۱ تا ۵)

پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر، جس نے سب کچھ پیدا کیا، اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے، جس نے قلم سے تعلیم دی، انسان کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷﴾ (سورۃ الانبیاء: ۷)

اگر تمہیں خود علم نہیں ہے تو نصیحت کا علم رکھنے والوں سے پوچھ لو۔

تیسری جگہ فرمایا:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴿۵۹﴾ (سورۃ النساء: ۵۹)

پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اگر واقعی تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اُسے اللہ اور اس کے رسول کے حوالے کر دو، یہی طریقہ بہتر ہے اور اس کا انجام بھی سب سے بہتر ہے۔

پہلی آیت میں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ قرآن کریم کی سب سے پہلی وحی ہے یا کہئے کہ سلسلۂ وحی کی پہلی قسط ہے، اس پہلی وحی میں علم حاصل کرنے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے خود ہی بتلا دیا کہ اسلام میں علم حاصل کرنے کی کتنی اہمیت ہے، اور ظاہر ہے کہ آیت میں پڑھنے سے اصلاً قرآن کریم یعنی احکاماتِ الٰہیہ کو پڑھنا اور سیکھنا ہی مراد ہے، پس معلوم ہوا کہ علمِ دین کا حصول ہر مسلمان پر لازم اور ضروری ہے۔

دوسری آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ علم حاصل کرنے کا طریقہ سوال ہے اس لئے کہ علم

خود سے حاصل نہیں ہوجاتا، بذریعہ مطالعہ بھی اگرچہ علم حاصل ہوجاتا ہے مگراس کا معتبر ہونا غیر یقینی ہوتا ہے، اس کے برخلاف جوعلم استاذ سے اور عالم سے حاصل ہو وہ اطمینان بخش اور معتبر علم ہوتا ہے، اس لئے فرمایا کہ اگر تمہیں نہیں معلوم ہے تو علماء سے معلوم کرلو، یہی علم حاصل کرنے کا سب سے اچھا اور آسان طریقہ ہے۔

تیسری آیت میں بتایا جارہا ہے کہ کسی معاملے میں یا کسی مسئلے میں عوام کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہوجائے تو انہیں چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کریں، اور جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پردہ فرما جائیں تو اُن کے دین کے ماہرین یعنی علماء کرام کی طرف رجوع کریں تاکہ وہ کتاب وسنت میں غور کرکے اس مسئلے کا صحیح جواب فراہم کریں؛ اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ ہر عمل سے پہلے علم ہے اور علم بھی معتبر لوگوں یعنی ایسے علماء کے ذریعہ حاصل کرنا چاہیئے جو کتاب وسنت کے ماہر ہوں۔

ان تین آیتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات علم دین کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالتی ہیں، جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا تعلق ہے تو آپ نے بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو علم دین حاصل کرنے کی بار بار تاکید کی ہے اور مختلف طریقوں سے علم دین کی تحصیل کی ضرورت کو اُجاگر فرمایا ہے، ارشاد ہے:

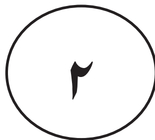
طَلَبُ العلمِ فريضة على كل مسلم (ابن ماجہ:۱/۸۱) علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

معلوم ہوا کہ بہ قدر ضرورت علم دین کا حاصل کرنا اسلام کے بنیادی احکام میں داخل اور تمام مسلمانوں پر فرضِ عین ہے، کوئی مسلمان اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

نیز ایک طویل حدیث امام منذری رحمہ اللہ نے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ضروری دینی علم حاصل کرنے کے لئے صرف ایک سال کی مہلت دی ہے، اس کے بعد عذابِ الٰہی کے نازل ہونے کی وعید سنائی ہے۔ (الترغیب والترہیب:۱/۱۰۷)

انہی وجوہ سے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے سب سے پہلی نصیحت بہ قدرِ ضرورت علمِ دین

حاصل کرنے کی فرمائی ہے اور ساتھ ہی اس کے دو طریقے بھی بتلا دئے ۱ خواہ کتاب پڑھ کر یعنی با قاعدہ طور پر یا ۲ عالموں سے پوچھ پوچھ کر یعنی زبانی طور پر۔ مطلب یہ ہے کہ جن کی عمر اور فرصت میں گنجائش ہے وہ با قاعدہ طور پر اساتذہ کے ذریعہ تعلیمی نصاب پورا پڑھیں اور جن کی عمر اور فرصت میں گنجائش نہیں وہ علماء سے تعلق رکھیں جب موقع ملے تھوڑا تھوڑا علم حاصل کرتے رہیں اور جب ضرورت پیش آئے مسائل معلوم کرلیا کریں۔



سب گناہوں سے بچے

گناہ زندگی کے مقصد کو متأثر کرتا ہے، گناہ کی حقیقت حق تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے حق تعظیم کی خلاف ورزی ہے، گناہ چھوٹا ہو یا بڑا، ظاہری ہو یا باطنی آدمی کے دین اور تعلق مع اللہ کو برباد کرنے والا ہے، اس لئے حضرت ؒ نے علم دین حاصل کرنے کی ترغیب کے فوراً بعد اس کا ذکر فرمایا ہے۔

علم ـــ یعنی قرآنی و نبوی علم ـــ دو چیزوں کی طرف آدمی کی راہ نمائی کرتا ہے، ۱ کیا کیا کام کرنے چاہئیں، ۲ کن کن کاموں سے بچنا چاہیئے، ایک کو معروفات دوسرے کو منکرات کہتے ہیں، دوسرے الفاظ میں معروفات نیکی کا اور منکرات بدی اور گناہوں کا نام ہے۔

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں دونوں حکموں کو بجالانا ہے، کیوں کہ دونوں کے مجموعے کو اسلام کہا جاتا ہے، قرآن و حدیث میں بندوں کو دونوں باتوں کی طرف برابر توجہ دلائی گئی ہے، اُن پر عمل کرنے کا اور اُن کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ دیا گیا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

(سورۃ اٰل عمران: ۱۱۰)

تم وہ بہتر اُمت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے وجود میں لائی گئی ہو، تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اہلِ کتاب ایمان لاتے تو یہ اُن کے حق میں کہیں بہتر ہوتا، ان میں سے کچھ تو مومن ہیں مگر ان کی اکثریت نافرمان ہے۔

ایک اور جگہ ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ (سورۃ اٰل عمران: ۱۰۴)

اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بُلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور بُرائی سے روکیں، ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

(سورۃ اٰل عمران: ۱۱۴)

یہ لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، اچھائی کی تلقین کرتے اور بُرائی سے روکتے ہیں اور نیک کاموں کی طرف لپکتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کا شمار صالحین میں ہے۔

دیکھئے! پہلی آیت میں اس امت کی خصوصیت اور فرضِ منصبی و ذمہ داری کا ذکر کیا گیا ہے کہ اُن کا کام اور اُن کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ انسانیت کے درمیان اچھی باتوں کو پھیلاتے اور بُری باتوں سے منع کرتے اور روکتے رہتے ہیں۔ دوسری آیت میں اس امت کو بطور

خاص حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم یہود ونصاریٰ جیسے بُرے انجام سے اپنے کو بچانا چاہتے ہو تو تمہارے درمیان ایک جماعت ہمیشہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کے فریضے کو انجام دیتی رہے، اس سلسلے میں یاددہانی اور مذاکرہ کرتی رہے۔ تیسری آیت میں یہود ونصاریٰ میں سے بعض لوگوں کی ــــ جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہے ــــ تعریف کرتے ہوئے انہیں مومن اور صالح بندے قرار دیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان زندگی میں اچھے بُرے سب ہی کام کرتا رہتا ہے، اسلام سکھاتا ہے کہ اچھے کام کرو بُرے کام مت کرو، جب علم آجائے گا تو اچھے بُرے کی تمیز ہوجائے گی، چناں چہ ایک عقل منداور ایمان دار بندہ کو جیسے جیسے اچھی باتیں معلوم ہوتی جائیں گی کرتا چلا جائے گا اور جیسے جیسے بُری باتوں کا علم ہوتا جائے گا اُن سے بچتا اور دور ہوتا چلا جائے گا، اسی کا نام اسلام اور فرماں برداری ہے جس سے مقصدِ حیات کی تکمیل ہوتی ہے۔

اگر کوئی آدمی اس کے برخلاف کرتا ہے یعنی اچھے کام چھوڑ دیتا ہے اور بُرے کام کرتا ہے تو وہ گنہ گار اور نافرمان ہے، اور زندگی کے مقصد کو کھوٹا کرنے والا ہے، نیکی نہ کرنا بھی گناہ ہے، بُرائی کا مرتکب ہونا بھی گناہ ہے، ظاہر ہے کہ گنہ گار ــــ خواہ نیکی نہ کرنے کا مجرم ہو خواہ بدی اور برائی کا مرتکب ہو ــــ کامیابی کے اعتبار سے بڑے خطرے میں ہے، اس لئے ہر مومن کو گناہ سے بچنے کا اہتمام کرنا بہت ضروری ہے۔

گناہ کا تعلق تمام اعمال سے ہے، اور اعمال تین طرح کے ہوتے ہیں: ۱ـ اعمالِ قلب: دل سے سرزد ہونے والے اعمال، ۲ـ اعمالِ زبان: زبان سے سرزد ہونے والے اعمال، ۳ـ اعمالِ جوارح: یعنی جسم کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہونے والے اعمال! اب مثلاً دل کو صبر وشکر کرنے کا حکم ہے وہ بے صبری اور ناشکری کرے تو یہ گناہ ہے، دل کو حسد اور کینے سے منع کیا گیا ہے پھر بھی وہ کسی سے حسد رکھے یا کینہ رکھے تو یہ گناہ ہے، اسی طرح زبان کو مثلاً تلاوتِ قرآن کا حکم دیا گیا ہے مگر وہ قرآن سیکھنا اور تلاوت کرنا نہیں چاہتی تو یہ زبان کا گناہ ہے، جھوٹ، غیبت وغیرہ سے روکا گیا ہے مگر زبان ان امور کا ارتکاب کرتی ہے تو یہ زبان کا گناہ

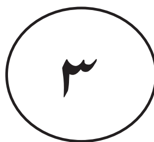
ہے، اسی طرح مثلاً آنکھ کو، کان کو، ہاتھ، پیر، پیٹ اور شرم گاہ سے متعلق کچھ کرنے کے احکام ہیں کچھ بچنے کے، تو اگر یہ اعضاء کرنے کے کاموں کو قصداً ترک کرتے ہیں اور بچنے کے کاموں میں مبتلا ہوتے ہیں تو یہ اعضاء وجوارح کے گناہ ہوتے ہیں۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ مومن کو ایجابی اور سلبی ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہوں سے بچتے رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہنا چاہئے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

(سورۃ الانعام: ۱۲۰)

اور تم ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہوں کو چھوڑ دو، یہ یقینی بات ہے کہ جو لوگ گناہ کماتے ہیں اُنہیں اُن جرائم کی جلد ہی سزا ملے گی، جن کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے۔



اگر کوئی گناہ ہوجائے تو فوراً توبہ کرلے۔

جب انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت وعظمت کے مدنظر تمام گناہوں سے بچنے کی ممکن کوشش کرنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور کامیابی نصیب فرماتے ہیں اور اپنی خاص مدد شامل حال فرماتے ہیں، تاہم چوں کہ انسان خیر وشر یعنی بھلائی اور بُرائی کا مُرکب ہے اور نفس وشیطان کی سازشوں اور حملوں کی زد میں ہے اس لئے کبھی کبھی غفلت ہوکر اللہ تعالیٰ کی کسی نافرمانی اور گناہ کا سرزد ہوجانا بھی ممکن ہے، کیوں کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی انسان گناہ سے معصوم نہیں

---

[1] تفصیل ''جزاء الاعمال'' نامی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے اور گناہوں سے واقفیت کے لئے ''ستر بڑے گناہ'' نام کی کتاب پڑھی جاسکتی ہے۔

ہے، اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے بندوں کے لئے اپنے فضل سے توبہ کا راستہ کھلا رکھا ہے، گویا اللہ تعالیٰ بندوں سے یوں فرما رہا ہے کہ میرے بندو! پہلے تو یہ کی کوشش کرو کہ کوئی نافرمانی اور گناہ کا صدور ہی نہ ہو، پھر بھی اگر کبھی چوک ہو جائے اور کوئی گناہ کر بیٹھو تو پھر بلا تاخیر معافی مانگ کر مجھے راضی کر لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ توبہ بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے، واقعی اگر یہ رحمت و نعمت نہ ہوتی تو ہم بندے برباد ہی ہو جاتے، قہرِ الٰہی سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہوتی، توبہ کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝١٧

(سورۃ النساء: ۱۷)

اللہ نے توبہ قبول کرنے کی جو ذمہ داری لی ہے وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی سے بُرائی کر ڈالتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، چناں چہ اللہ اُن کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور اللہ ہر بات کو خوب جاننے والا بھی ہے حکمت والا بھی ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ ارشاد فرمایا:

إِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝٧٠

(سورۃ الفرقان: ۷۰)

ہاں مگر جو کوئی توبہ کر لے، ایمان لے آئے، اور نیک عمل کرے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَتُوبُوٓا إِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝٣١ (سورۃ النور: ۳۱)

اور اے مومنو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تا کہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔

ان آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اگر اپنی نادانی اور نفس و شیطان کے بہکاوے میں آ کر حق تعالیٰ شانہٗ جیسے عظیم و کریم رب کی نافرمانی کر بیٹھے اور گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے مایوس نہ ہونا چاہیے، ندامت اور شرمندگی کے ساتھ اور قبولیت کے پورے یقین کے ساتھ دستِ دعا اُٹھا کر معافی مانگ لینی چاہیئے کہ ''اے کریم! میں تیری عظمت کا حق ادا کرنے میں ناکام ہو گیا ہوں مگر میں کہاں جاؤں سوائے تیرے کوئی میرا نہیں ہے پس تجھ ہی سے درگذر کی التجا کرتا ہوں، تیرے ہی حضور گڑگڑاتا ہوں مجھے معاف فرمادے''۔ تو اللہ تعالیٰ فوراً معاف فرمادیتے ہیں اور آدمی کا دل اس گناہ کی ظلمت سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ:

التائب من الذنب کمن لا ذنب له گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو۔ (ابن ماجہ: ۴۲۵۰)

اس لئے توبہ میں تاخیر نہ کرنا چاہیئے، بلکہ توبہ کرتے ہی رہنا چاہیئے کیوں کہ ہم بندے غفلت و نسیان کے شکار ہیں، پتہ نہیں کب کیا گناہ ہو جائے اور پتہ بھی نہ چلے، اس لئے توبہ کرتے رہنا چاہیئے۔

۴

ہر ایک کا حق ادا کرے، کسی کو زبان یا ہاتھ سے تکلیف نہ دے، کسی کی بُرائی نہ کرے۔

اسلام میں حقوق العباد کی بڑی اہمیت ہے، ایک اعتبار سے اس کو حقوق اللہ پر بھی فوقیت حاصل ہے، یعنی اس اعتبار سے کہ حقوق اللہ تو اللہ تعالیٰ معافی مانگنے پر بلکہ بغیر معافی مانگے بھی محض اپنے لطف وکرم سے بخش دیتا ہے لیکن حقوق العباد میں اس کا معاملہ یہ ہے کہ جن کا حق ہے انہی سے معاف کرانے کا مطالبہ فرماتا ہے، یوں بخشش کے اعتبار سے حقوق العباد کا معاملہ زیادہ سنگین ہے، باقی حقوق اللہ کی عظمت اوران کا احترام یقیناً اس کی شان کے مطابق اہم ہے۔

بہ ہر حال حضرت فرمارہے ہیں کہ ہر ایک کا حق ادا کرے، اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حقوق بھی داخل ہیں باقی تمام اہلِ حقوق کے حقوق بھی شامل ہیں۔

اسلام ایک کامل ومکمل دین ہے، اس میں اللہ تعالیٰ سے لے کر بندوں تک، پھر بندوں میں انسانوں سے لے کے جانوروں تک کے حقوق اپنے ماننے والوں پر لازم کئے گئے ہیں، حضرت رحمہ اللہ کا ہی ایک رسالہ ''حقوق الاسلام'' کے نام سے ہے، حقوق العباد کی تفصیل کے لئے اس کا مطالعہ کرنا کافی ہے، اس سے تمام لوگوں کے حقوق کا علم ہوگا، پھر جب علم ہوگا تو عمل کی طرف بھی توجہ ہوگی، یوں زندگی میں دین صحیح معنوں میں آتا چلا جائے گا۔ میں یہاں صرف عنوانات درج کررہاہوں تاکہ حقوق کے پہلوؤں کا اندازہ ہوسکے کہ ہم پر آخر کس کس کا حق ہے؟

اللہ تعالیٰ کے حقوق، پیغمبر کے حقوق، صحابہ واہلِ بیت کے حقوق، علماء ومشائخ کے حقوق، والدین کے زندگی میں حقوق، والدین کے انتقال کے بعد کے حقوق، دادا، دادی، نانا، نانی کے حقوق، اولاد کے حقوق، دودھ پلانے والی انّا کے حقوق، سوتیلی ماں کے حقوق، بہن بھائی کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، زوجین کے حقوق، حاکم اور رعایا کے حقوق، سسرال والوں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، عام مسلمانوں کے حقوق، یتیموں اور ضعیفوں کے حقوق، مہمان کے حقوق، دوستوں کے حقوق، غیر مسلموں کے حقوق، جانوروں کے حقوق، اپنے نفس کے حقوق وغیرہ ۔

ان عنوانات ہی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام میں حقوق کی کتنی اہمیت ہے، اور اگر آپ ان حقوق کی تفصیل معلوم کریں اور اس کے بعد مسلم سماج کی صورتِ حال پر ایک نظر ڈالیں تو پتہ چل جائے گا کہ کس قدر بے باکی اور آزادی سے ایک دوسرے کے حقوق تلف کئے جا رہے ہیں، ان حقوق کے مطالبات ہی کو لے کر آپس کی نا اتفاقیاں اور ناخوش گواریاں عام ہوگئی ہیں، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں تو کسی کے حق کی پروانہ کروں مگر دوسرا میرا حق ادا کرتا رہے، حالاں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جو طریقہ سکھایا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم فرماتے ہیں ''دوسروں کے حقوق ذمہ داری سے ادا کردو، اور اپنے حقوق جو دوسروں پر ہیں اسے ان سے طلب کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے طلب کرلو''

اس نمبر میں ایک بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ ہر ایک کا حق ادا کرنا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ حق ادا تب ہو سکے گا جب کہ اس کو جانا بھی جائے، بغیر جانے کیسے ادا ہوگا، معلوم ہوا کہ حقوق کی تفصیل کا علم بھی حاصل کرنا چاہیئے؛ دوسری بات اسی نمبر میں یہ بتلا رہے ہیں کہ کسی کو زبان یا ہاتھ سے تکلیف نہ دے۔

حدیث پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویدہٖ (بخاری:۱۵)	حقیقی مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

زبان یا ہاتھ سے مراد قول وفعل ہے، یعنی ایسی باتیں نہ کرے جو دوسروں کی تکلیف کا سبب ہوں، اسی طرح ایسا کام بھی نہ کرے جس سے کسی کو تکلیف پہونچے، مومن کو ہر ایک کے حق میں رحمت اور ہر کسی کا خیر خواہ بن کر رہنا چاہیئے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کسی کی بُرائی نہ کرے، یعنی نہ سامنے نہ پیچھے، قرآن کریم میں دونوں کو مذموم اور بُرا عمل بتلایا گیا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝١ (سورۃ الھمز ۱:۵) بڑی خرابی ہے اُس شخص کی جو پیٹھ پیچھے دوسروں پر عیب لگانے والا، (اور) منہ پر طعنے دینے کا عادی ہو۔

تمسخر، غیبت، بہتان اور تہمت، چغلی، لگائی بجھائی، بدزبانی وسخت کلامی، تحقیر و بے آبروئی، لعن طعن بددعا وغیرہ سب چیزیں برائی کرنے میں ہی داخل ہیں۔

۵

مال کی محبت اور نام کی خواہش نہ رکھے، نہ بہت اچھے کھانے کپڑے کی فکر میں رہے۔

محبت قلبی لگاؤ کو کہتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں، ۱ طبعی ۲ عقلی : پہلی قسم غیر اختیاری ہے، دوسری ہمارے اختیار میں ہے، مثلاً دولت اور شہرت سے طبعی طور پر محبت کا ہونا ہمارے قابو میں نہیں ہے، اس لئے اس کا مؤاخذہ بھی نہیں ہے خواہ کتنی شدید ہو، مگر انہیں چیزوں کو عقلاً محبوب رکھنا اختیاری معاملہ ہے، یعنی دل جتنا بھی دولت یا شہرت کی طرف مائل ہو عقل سے ہم اس کو بُرا سمجھتے اور اس کے خلاف عمل کرتے ہیں تو یہ کافی ہے، اور اگر عقل سے

بھی اِسے اچھا سمجھتے اور اسی کی چکّر میں رہتے ہیں یہاں تک کہ حلال وحرام کی تمیز بھی نہیں کرتے یا ان میں اس طرح مشغول رہتے ہیں کہ بندگی کے تقاضوں کو بھی فراموش کر بیٹھتے ہوں تو پھر یہ مذموم صفت اور قابلِ اصلاح مرض ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ⑧ (سورۃ العٰدیات:۸)

اور حقیقت یہ ہے کہ وہ (یعنی کافر) مال کی محبت میں بہت پکا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِن لکل امۃٍ فتنۃ و فتنۃ امتی المال (ترمذی:۴/۴۹۲)

ہر امت کے لئے ایک آزمائش ہے اور میری امت کی آزمائش مال ہے۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا:

فاتقوا الدنیا و اتقوا النساء (فیض القدیر:۱/۱۷۲)

دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو۔

یعنی مال کمانے میں بے راہ روی اور عورتوں کی بے جا باتوں میں آنے سے بچو۔

حُبِّ مال کی طرح حبِّ جاہ یعنی منصب و مرتبہ اور شہرت کی طلب بھی بہت خطرناک اور قابلِ اصلاح بیماری ہے، آدمی جس قدر محدود تعلقات والا ہوگا عافیت وسلامتی میں رہے گا، اور جس قدر شہرت ومنزلت پاتا جائے گا خطرات ومشکلات میں گھرتا چلا جائے گا، بسا اوقات دین وایمان محفوظ رکھنا بھی مشکل ہوجاتا ہے، بالخصوص اس دور میں تو مرتبہ وشہرہ ہلاکت ہی کا سبب ہوگیا ہے؛ ہاں! اللہ پاک بندے کی طلب و چاہت کے بہ غیر محض اپنی قبولیت اور رضا مندی کی وجہ سے کسی کو شُہرت وقبولیتِ عام نصیب فرمادیں تو یہ ان کے انعامات میں سے نقد انعام ہے، ایسے بندوں کو وہ مبتلائے کبر وعجب اور مجرمِ ظلم وجبر ہونے سے خود ہی بچالیتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ نام ونمود اور مرتبہ ومقام کا طلب گار نہ بنے، اپنے کام میں عاجزی وبندگی کے ساتھ لگا رہے، سوائے حق تعالیٰ کی رضا وخوش نودی کے کسی اور چیز کی خواہش نہ رکھے، پھر

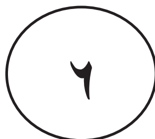
حق تعالیٰ جو عطا فرمائیں اُن کا کرم اور انعام ہے جو سراسر خیر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں مرضوں کی مذمت اپنے ایک ارشاد گرامی میں اسی طرح جمع کر کے بیان فرمادی ہے:

ما ذئبان جائعان أرسلا فی غنم بافسد لها من حرص المرء علی ماله وشرفه لدینه (ترمذی: ۴/۵۰۷)	دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ کا اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا آدمی کی مال ومنصب کی حرص اس کے دین کا نقصان کرتی ہے۔

اس نمبر میں جو دوسری بات بیان فرمائی گئی ہے کہ بہت اچھے کھانے کپڑے کی فکر میں نہ رہے تو یہ مرض بھی حبِّ جاہ ومنصب کے مرض ہی سے پیدا ہوتا اور اسی کا لازمی اثر ہوتا ہے، اگر دولت وشہرت کی طلب نکل جائے گی تو اس کے اثرات بھی خود بہ خود ختم ہو جائیں گے، باقی حق تعالیٰ نے کسی کو نعمتیں اور نعمتوں کے اسباب عطا فرما رکھے ہیں تو اگر وہ بنا کسی غرور وگھمنڈ اور بغیر کسی ریاء ودِکھلاوے کے محض شکر گذاری کے جذبات سے اچھا کھاتا پہنتا اور رہتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اپنی عطا کردہ نعمتوں کو برتتا ہوا دیکھے۔

ان اللہ یحب ان یری اثر نعمته علی عبده (فیض القدیر: ۲/۳۸۷)	یقیناً اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کا اثر اپنے بندوں پر دیکھنا چاہتا ہے۔



اگراس کی خطا پر کوئی ٹوکے تو اپنی بات نہ بنائے، فوراً اقرار اور توبہ کرلے۔

آدمی خطا ونسیان کا پُتلہ ہے، بھول چوک اور غلطیوں کا ہو جانا اس کے لئے کوئی عیب نہیں ہے لیکن غلطیوں پر اصرار کرنا، انہیں بُرا نہ سمجھنا، اس کی جانب توجہ دلانے پر خوش دلی سے قبول نہ کرلینا اور بحث ومباحثہ اور تاویل وتوجیہ کے ذریعہ اُسے برحق جتانے کی بے جا سعی کرنا یہ عادتیں عیوب ہیں اور بدترین مرض ہیں، ان کی اصلاح دین کی درستگی کے لئے بہت ضروری ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبر کی تعریف ہی یہ فرمائی ہے:

الکبر بطر الحق و غمط الناس — تکبر حق کو قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔ (مسلم: ۱/ ۹۳)

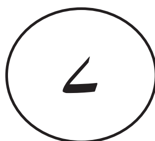
اس سے معلوم ہوا کہ غلطی تسلیم نہ کرنا اور کٹ حجتی کے ذریعہ اسی پر اصرار کرنا حقیقی تکبر ہے اور تکبر بدترین رذائل میں سے ہے، اس مرض نے ابلیس کو مقبولیت کے مقام سے گرا کر مردود و منحوس بنا دیا تھا۔

حدیث پاک میں ہے:

لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر (مسلم: ۱/ ۹۳) — وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہوگا۔

بہر حال ! کسی کا اپنی غلطی پر ٹوکنا ہمیں بُرا نہ لگنا چاہیئے، بلکہ خوشی اور شکریئے کے ساتھ قبول کر لینا چاہیئے، پھر اگر اُس نے کسی واقعی غلطی پر ٹوکا ہے تو فوراً اس غلطی کی اصلاح و درستگی کر لینا چاہیئے یا آئندہ نہ کرنے کا ارادہ کر لینا چاہیئے، اور اگر اس نے غلط فہمی سے ٹوکا ہے تو اس کی توجہ دہانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے صحیح بات سے تہذیب کے ساتھ مطلع کر دینا چاہیئے تاکہ اس کی غلط فہمی دور ہو جائے اور اپنے اندر بھی کبر نہ پیدا ہونے پائے۔

گناہ ہو جانا جتنی افسوس ناک بات ہے گناہ کے بعد ندامت کا نہ ہونا اور توبہ کی طرف توجہ نہ ہونا اس سے بھی زیادہ خطرناک صورتِ حال ہے، اس لئے کہ اگر یہی حالت رہی تو آدمی گناہ کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کا دل زنگ پر زنگ لگتے رہنے کی وجہ سے تباہ اور اللہ تعالیٰ کی خشیت و محبت سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے، اس لئے آدمی کو چاہیئے کہ جیسے ہی کوئی غلطی سرزد ہو جائے ـــ خواہ خود سے احساس ہو جائے یا کوئی اور توجّہ دلائے ـــ تو فوراً ندامت و شرمندگی کے احساسات کے ساتھ رجوع الی اللہ ہو کر معافی تلافی اور اپنے اعمال نامے کی صفائی کر لے، اس طرح دنیا میں بھی سکون مل جائے گا اور آخرت کی ذلت و رسوائی سے بھی بچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

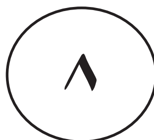


بہ غیر سخت ضرورت کے سفر نہ کرے،

سفر میں بہت سی باتیں بے احتیاطی کی ہو جاتی ہیں، بہت سے نیک کام چھوٹ جاتے ہیں، وظیفوں میں خلل پڑ جاتا ہے، وقت پر کوئی کام نہیں ہو پاتا۔

مقولہ مشہور ہے"السفر کالسقر" حالاں کہ سفر میں بہت سے دینی و دنیوی منافع بھی ہیں، جیسے دعوتِ دین اور تبلیغِ اسلام کی ضرورت سے کئے جانے والے اسفار، حج و عمرہ کا سفر، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے سفر، رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کے لئے سفر، ایسے اسفار یقیناً نافع ہیں، اسی طرح کاروباری ضرورت کے لئے کئے جانے والے اسفار میں بھی بہت فوائد و مصالح موجود ہیں، اسی وجہ سے حضرت والاؒ نے مطلقاً سفر سے منع نہیں فرمایا بلکہ بہ غیر سخت ضرورت کے سفروں میں نکلنے سے منع فرمایا ہے، اس لئے کہ حضر میں یعنی گھر پر انسان کے لگے بندھے معمولات ہوتے ہیں، خصوصاً سالکین اور خدامِ دین کی ذمے داریاں اور معمولات تو اور بھی زیادہ ہوتے ہیں، اور معمولات کی پابندی بڑی خیر و برکت کا سبب بنتی ہے لیکن جب آدمی سفر میں نکلتا ہے تو یہ سارے معمولات متأثر ہو جاتے ہیں اگر چہ سفر میں شریعت کی طرف سے بڑی رعایتیں اور سہولتیں دی گئی ہیں، نیز مسافر کو گھر پر کئے جانے

والے نفل اعمال کا اجر بھی ___ نہ کر سکنے کے باوجود ___ ملتا رہتا ہے تاہم جو برکت پابندی میں ہے اور جو عافیت اپنے مقام پر رہنے میں ہے اس سے محرومی ضرور ہو جاتی ہے جو ایک طرح بے اطمینانی اور بے چینی کا سبب بن کر جمعیتِ خاطر کی دولت سے محروم کر دیتی ہے، اس لئے سفر شدید ضرورت ہی پر کرے، معمولی وجوہات سے یا محض یاروں دوستوں کے تقاضوں پر ہرگز سفر نہ کرے تا کہ ان نقصانات سے بچ سکے جن کا ذکر اس نمبر میں حضرت نے خود فرمایا ہے۔ یعنی بے احتیاطی کے کاموں کا ہو جانا، نیک کاموں کا چھوٹ جانا، وظیفوں اور معمولات میں فرق پڑ جانا اور ہر کام کا بے وقت ہونا وغیرہ۔



نہ بہت ہنسے نہ بہت بولے، خاص کر نامحرم سے بے تکلفی کی باتیں نہ کرے۔

زیادہ ہنسنا بولنا دل کے امراض میں سے ہے، اور وہ دل کو مُردہ و بے نور بنا دیتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لا تکثر الضحک فان کثرۃ الضحک تمیت القلب	زیادہ مت ہنسو، اس لئے کہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔

(ترمذی: ۴/۴۷۸)

خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت باوقار رہا کرتے تھے، بہت ہنسنا تو دور کی بات ہے کبھی کبھار ہی کم ہی لوگوں نے آپ کو ہنستا ہوا دیکھا ہے، ہاں خوشی و مسرت کے موقعوں پر خوش ہونا فطری امر ہے اور دل کی خوشی چہرہ پر عیاں ہو ہی جاتی ہے، چناں چہ ایسے موقعوں پر آپ بھی مسرور

ہوتے، خدا کا شکر بجالاتے اور دل کی یہ کیفیت چہرۂ مبارک پر تبسُّم کی صورت میں ظاہر ہوجاتی، بلکہ آپ کی ایک مسکراہٹ ناظرین کے دلوں کے غم دور کرجاتی اور حاضرین پر خوشیاں لُٹا جاتی، کبھی دندانِ مبارک بھی کُھل جاتے تھے، جورات کو دن کرجاتے اور دن کی روشنی بڑھا دیتے مگر غافلوں اور بے حِسوں کی طرح ہنسنا ہنسانا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پسندیدہ مشغلہ نہ تھا، ہمیں بھی اس سے احتراز کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسری بات بہت نہ بولنے کی ہے تو جس شخص کو اس بات کا یقین ہے کہ زبان سے نکلنے والی ہر بات تولی جائے گی تو وہ شخص یقیناً بہت بولنے کی حماقت کبھی نہیں کرسکتا۔ علماء فرماتے ہیں کہ اعمال تین طرح کے ہیں: ۱۔ لسانی، ۲۔ قلبی، ۳۔ بدنی! اور تینوں قیامت کے دن تولے جائیں گے، لسانی اعمال اقوال ہیں، اور زبان کے ذریعہ کم از کم بیس بڑے گناہ ہوجاتے ہیں[۱]، پس معلوم ہوا کہ بہت بولنا بہت مسئولیت کا سبب ہے اور کون عقل مند ہے کہ بلا وجہ اپنی مسئولیت میں اضافہ کرتا رہے، قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾ (سورۃ ق:۱۸)

انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا مگر اس پر ایک نگراں مقرر ہوتا ہے، ہر وقت (لکھنے کے لئے) تیار!

ایک اور جگہ فرمایا:

اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾ (سورۃ الزخرف:۸۰)

کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم اُن کی خفیہ باتیں اور ان کی سرگوشیاں نہیں سُنتے؟ نیز ہمارے فرشتے اُن کے پاس ہیں، وہ سب کچھ لکھتے رہتے ہیں۔

---

[۱] یہ بیس بڑے گناہ اور ان کی مذمت میرا رسالہ 'مہلکاتِ باطنی' کے ضمیمے میں ملاحظہ کرلیں۔

ایک جگہ منافقین کی مذمت میں فرمایا:

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ (سورۃ آل عمران: ۱۸۱)

ہم اُن کی یہ بات بھی (ان کے اعمال نامے میں) لکھ لیتے ہیں، اور انھوں نے انبیاء کو جو ناحق قتل کیا ہے، اس کو بھی اور (پھر) کہیں گے کہ: ’’دہکتی آگ کا مزہ چکھو‘‘۔

معلوم ہوا کہ ہماری زبان سے نکلنے والے اقوال وکلمات سب اعمال ہیں اور اعمال کی جزا بھلی یا بُری یقیناً سامنے آنے والی ہے، پس ہر گفتگو سے قبل غور کر لینا چاہیئے کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو مناسب اور بہ قدر ضرورت ہے یا نہیں؟ اس کے بعد بولنا چاہئے تاکہ بات قیامت میں حساب دینے کے وقت اور خود اس دنیا میں بھی بول دینے کے بعد شرمندگی اور پشیمانی کا سبب نہ بنے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلیقل خیراً اولیصمت (بخاری: ۱۰/۴۴۵)

جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیئے کہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ خاموش رہے۔

تیسری ہدایت اس نمبر میں یہ ہے کہ بہ طور خاص نامحرموں سے یعنی جن سے پردہ کرنا شرعاً ضروری ہے بے تکلفی اور بے احتیاطی کی باتیں نہیں کرنا چاہیئے، کیوں کہ اس کا انجام کسی سنگین گناہ یا ناجائز تعلق کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے، حدیث میں ہے:

وزنا اللسان المنطق (بخاری: ۶۲۴۳)

زبان بھی زنا کرتی ہے اور اس کا زنا نامحرم سے گفتگو کرنا ہے۔

جس حرکت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے از قبیلِ زنا قرار دیا ہو سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر مذموم حرکت ہوگی، آج گھروں میں اِن باتوں کا اہتمام تو کیا کرتے شرعی پردے جیسے فریضے پر عمل کرنے سے بھی اچھے اچھے دین دار کہلائے جانے والے گھرانے اور افراد محروم ہیں،

حالاں کہ ازواجِ مطہرات کو تک اللہ تعالیٰ نے پردہ کا حکم دیا، وہ بھی اس وقت جب کہ اُن کے زمانے میں اس اُمت کے سب سے اچھے عمل اور مضبوط ایمان والے لوگ رہا کرتے تھے، ارشاد فرمایا:

فَلَا تَخۡضَعۡنَ بِالۡقَوۡلِ فَيَطۡمَعَ الَّذِىۡ فِىۡ قَلۡبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلۡنَ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۝۳۲ (سورۃ الاحزاب: ۳۲)

لہذا تم نزاکت کے ساتھ بات مت کیا کرو، کبھی کوئی ایسا شخص بے جا لالچ کرنے لگے جس کے دل میں روگ ہوتا ہے، اور بات وہ کہو جو بھلائی والی ہو۔

اس سے آپ اندازہ کیجیے کہ اسلامی تعلیمات نے انسانی فطرت کا کس قدر لحاظ رکھا ہے، غیر عورتوں سے بے ضرورت بولنا اسی طرح عورتوں کا غیر مردوں سے بے تکلف گفتگو کرنا اگر عہد نبوی میں اور صحابہ وصحابیات جیسے ایمان والے طبقے میں فطرتاً مُضر ہوسکتا ہے تو بے حیائی و بے احتیاطی کے اِس دور میں کتنا نقصان دہ اور اخلاق سوز عمل ہوسکتا ہے، اگر ہم اپنے سماج کی کوئی آبرو اور عزت بنائے رکھنا چاہتے ہیں تو اس ہدایت پر عمل بہت ضروری ہے، کم از کم سالکین راہِ خدا تو اپنا دامنِ تقویٰ اس خطرے سے محفوظ رکھنے کا اہتمام کرتے رہیں، ورنہ برسوں کی ریاضات وعبادات کا نور نفس کے ایک ہی حملے میں ضائع و برباد ہوجائے گا۔

یاد رہے کہ جس طرح نامحرم عورتوں سے بے تکلفی کا تعلق دین واخلاق کے لئے سمِ قاتل ہے اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ امردوں اور نوعمر بچوں سے قرب اور بے تکلفی بھی خطرناک ہے، مشائخ نے سالکین کو اس سے بہت ڈرایا ہے، کیوں کہ ایک شریف اور دین پسند آدمی عورتوں کی طرف میلان کے انجام سے ڈرتا ہے مگر اَمردوں کی طرف میلان سے اتنا زیادہ خوف نہیں محسوس کرتا، نتیجتاً اس سے زیادہ رُسوائی میں گرتا ہے۔ اعاذنا اللہ منه

۹

کسی سے جھگڑا تکرار نہ کرے۔

جھگڑا ابدترین بلا اور تمام امن وسکون کا غارت گر ہے، لڑائی جھگڑے سے زیادہ آدمی کی سلامتی اور سکون کو کوئی اور چیز تباہ نہیں کرتی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

انَّ ابغض الرجال الی اللہ الالد الخصم (بخاری:۵/۱۰۶)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ ناپسند آدمی وہ ہے جو سخت جھگڑالو ہو۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا:

من ترک المراء وھو محق بنی لہ (قصر) فی وسط الجنۃ (ابن ماجہ:۱/۱۹)

جو شخص حق پر رہنے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے اس کے لئے وسطِ جنت میں ایک محل بنایا جاتا ہے۔

اور یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ شبِ قدر کی تعین جھگڑے ہی کی نحوست سے اُٹھائی گئی، اسی طرح تکرار یعنی بحث ومباحثہ بھی بڑا ہی مذموم وناپسندیدہ عمل ہے، اکثر اس کا انجام بغض وعناد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو اور بڑی مصیبت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دونوں باتیں ناپسندیدہ تھیں، قرآن کریم میں بعض منافقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَیُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰی

اور لوگوں میں ایک وہ شخص بھی ہے کہ دنیوی زندگی کے بارے میں اس کی باتیں تمہیں بڑی اچھی لگتی ہیں، اور جو کچھ

سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵ (سورۃ البقرہ:۲۰۵)

اس کے دِل میں ہے اُس پر وہ اللہ کو گواہ بھی بناتا ہے، حالاں کہ وہ (تمہارے) دُشمنوں میں سب سے زیادہ کٹر ہے، اور جب اُٹھ کر جاتا ہے تو زمین میں اس کی چلت پھرت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اس میں فساد مچائے، اور فصلیں اور نسلیں تباہ کرے، حالاں کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

معلوم ہوا کہ جھگڑا تکرار روئے زمین کے فساد و بدامنی کا سبب ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو زمین میں امن واطمینان عطا فرمانا چاہتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے حقوق سکون سے ادا کرسکیں۔

جھگڑے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو قولی یعنی بحث ومباحثہ خواہ مذہبی ودینی امور میں ہوں یا معاشرتی وکاروباری امور میں بحث ومباحثے کا انجام بالآخر بغض وعداوت اور ضرب وقتل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، پھر کیا کیا ہوسکتا ہے بتلانے کی ضرورت نہیں؛ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۴۶ۚ (سورۃ الانفال:۴۶)

اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے، اور تمہاری ہَوا اُکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو، یقین رکھو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کہیں بیٹھ کر تقدیر کے مسئلے میں مباحثہ کررہے تھے، اتنے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہاں تشریف لے آئے تو سخت غضب ناک ہوئے اور فرمایا: ’’تم لوگوں کو انہی باتوں کا حکم دیا گیا ہے؟، پچھلی امتیں انہی بحثوں میں ہلاک ہوئی ہیں، میں تمہیں سخت تاکید کرتا ہوں، میں تمہیں سخت تاکید کرتا ہوں کہ ان بحثوں میں نہ پڑو‘‘ (ترمذی: ۲/۳۳) بہرحال جھگڑا تکرار سے بچنا بیسیوں آفتوں سے بچنے کا سبب ہے۔

۱۰

شرع کا ہر وقت خیال رکھے۔

شرع اور شریعت کے ایک ہی معنی ہیں، شریعت احکامِ خداوندی اور قانونِ الٰہی کو کہتے ہیں، اور اُن احکام کی عملی شکل کا نام سنت ہے، دونوں تعریفیں ایک دوسرے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہیں، سنت شریعت ہے، شریعت سنت ہے، یہ عمومی تعریف ہے، اصولی تعریف اپنی جگہ اہلِ علم کے لئے اہمیت رکھتی ہے، ہماری یہ زندگی بندگی کی آزمائش اور امتحان کے لئے وضع کی گئی ہے، یہ آزمائش ہمیں ایک مخصوص طرزِ زندگی اور وضع حیات کا پابند کئے بغیر نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض بندوں کو منتخب کر کے وہ خاص احکام اُن پر نازل کئے اور ان کے ذریعہ اپنے تمام بندوں کو پابند کیا کہ وہ ایسی ہی زندگی گذارنے کا اہتمام کر کے ابدی زندگی میں اپنی مرضی والی حیات کا انعام جیت لیں، اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو امتحان میں ناکام ہو جائیں گے، جس کا لازمی نتیجہ آخرت کی رُسوائی اور عذابِ دوزخ کی صورت میں سامنے آئے گا۔

ارشادِ ربانی ہے:

فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ (سورۃ البقرہ:۳۸)

جب میری ہدایتیں تم لوگوں کے پاس آئیں گی تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷

(سورۃ الاعراف:۷:۱۵۷)

چناں چہ جو لوگ اس (نبی) پر ایمان لائیں گے، اُس کی تعظیم کریں گے، اُس کی مدد کریں گے، اور اُس کے ساتھ جو نور اُتارا گیا اس کے پیچھے چلیں گے، تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔

ان آیتوں سے دو باتیں صاف معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ شریعت کا مقصد بندگی کی آزمائش ہے، دوسرے یہ کہ شریعت کی اتباع ہی میں دنیا و آخرت کی فوز و فلاح مُضمر ہے، پس مسلمانوں کو چاہیئے کہ ہر کام میں سب سے پہلے یہ معلوم کریں کہ شریعت میں یہ کام درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو طئے کرلیں کہ ہمیں ہرگز یہ کام نہیں کرنا ہے، خواہ نفس پر کتنا ہی گراں کیوں نہ گذرے، اور اگر درست ہے تو اب یہ معلوم کریں کہ اس کام کی تعمیل و تکمیل کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ جو طریقہ مسنون ہے اسی کے مطابق اس عمل کو انجام دیں، خلافِ سنت طریقوں کو اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ بچیں خواہ زمانہ اُسے پسند کرتا ہو یا ناپسند!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صاف وصریح ارشاد ہے:

ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما: کتاب اللّٰه، وسنة نبیه ﷺ- (مؤطا امام مالک:۲/۸۹۹)

میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، اللہ کی کتاب، اور اس کے نبی کا طریقہ، جب تک تم اس سے چمٹے رہو گے گُم راہ نہ ہو گے۔

اسی طرح فرمایا:

علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین

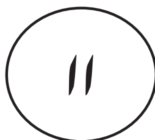
(مسند احمد:۴/۱۲۶)

تم پر لازم ہے میری سنت اور میرے ہدایت یاب خلفاء راشدین کی سنت (پر عمل کرنا)

نیز فرمایا:

اتبعوا السواد الاعظم فانه من شذ شُذفی النار (مشکوٰۃ:۱/۳۵۵)	(اختلافاتِ امت کے وقت علماء کی) بڑی جماعت یعنی جمہور علماء کا اتباع کرو، اس لئے کہ جو جماعت سے علاحدہ ہوگا وہ جہنم میں جائے گا۔

ان سب روایات سے پتہ چلا کہ شریعت نام ہے کتاب وسنت اور اجماعِ امت کا، اور شریعت میں عقیدہ وعمل دونوں داخل ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اپنا عقیدہ، عبادت، معاملات ومعاشرت اور باہمی حقوق تمام اُمور میں شرعی احکام کا احترام اور اُن پر عمل اپنے لئے ضروری سمجھیں، بہ قدرِ ضرورت ان باتوں کا علم حاصل کریں اور اپنا عمل اس کے موافق بنائیں۔ یہی کامیابی کا راستہ ہے۔



عبادت میں سستی نہ کرے۔

جب زندگی کا مقصد ہی بندگی ہے تو اس میں سستی وکاہلی کی کیا گنجائش نکل سکتی ہے؟ اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے:

المؤمن القوی خیر واحب الی اللّٰہ من المؤمن الضعیف وفی کل خیر احرص علی ما ینفعک واستعن باللّٰہ ولا تعجز (مسلم:۴/۲۰۵۲)	طاقت ور اور صحت مند مسلمان اللہ تعالیٰ کے نزدیک کم زور مسلمان سے بہتر اور محبوب ہے، ویسے تو سب ہی مسلمان اچھے ہیں۔ اپنے فائدے کی چیزوں کو حاصل کرنے کی ہمت کرو، اللہ تعالیٰ سے مدد لو، سستی وعاجزی مت دکھاؤ۔

پچھلی امتوں کے تذکرہ میں ارشاد ربانی ہوا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٦﴾ (سورۂ اٰلِ عمران: ۱۴۶)

اور کتنے سارے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی! انہیں اللہ کے راستے میں جو تکلیفیں پہونچیں ان کی وجہ سے نہ انہوں نے ہمت ہاری، نہ وہ کمزور پڑے اور نہ اُنہوں نے اپنے آپ کو جھکایا، اللہ ایسے ثابت قدم لوگوں سے محبت کرتا ہے۔

مومن چوں کہ اپنی زندگی کا مقصد عبادت و بندگی ہی سمجھتا ہے اس لئے اس کے واسطے عبادت میں چُستی اور ذوق وشوق کا پیدا ہو جانا بہت آسان ہے، کتنے ہی لوگ ہیں جو آج بھی بڑے ذوق وشوق اور پورے ایثار ومجاہدے کے ساتھ دین پر چلتے ہیں، بالخصوص عباداتِ واجبہ ونافلہ سب کا اہتمام کرتے ہیں، حتیٰ کہ اُن کی عبادتوں میں استقامت پر نہ سفر کی صعوبتیں اثر انداز ہوتی ہیں اور نہ مرض کی مشقتیں انہیں بے ہمت کرتی ہیں، نہ ہی معاش کی تنگی انہیں غافل کر پاتی ہے، اس کے برخلاف منافق کا حال یہ ہے کہ وہ چوں کہ زندگی کا مقصود دنیا کی نعمت وراحت اور شہرت ومنصب سمجھا ہوا ہے اس لئے ان چیزوں کے حصول میں تو صبح وشام ایک کر دیتا ہے مگر اللہ کے سامنے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جب بات آتی ہے تو بچنے کی صورتیں ڈھونڈھتا اور چھپنے کے راستے نکالتا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٤٢﴾ (سورۃ النساء: ۱۴۲)

اور جب یہ لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسمساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کے سامنے دِکھاوا کرتے ہیں، اور اللہ کا ذکر تھوڑا ہی کرتے ہیں۔

یہ سستی و کاہلی منافقوں کا حال ہے تو مومنین کا حال اس کے مقابل چستی و مستعدی کا ہونا چاہیئے، یہ عجز و کسل ایسی بلا ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی دعاؤں میں اس سے پناہ مانگی ہے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ۔۔۔۔۔۔۔ (نسائی:۵۴۲۸) اے اللہ! میں آپ سے سستی و کاہلی سے پناہ مانگتا ہوں۔

بہ ہر حال سستی کو قریب پھٹکنے نہ دینا چاہیئے، بالخصوص عبادت میں کاہلی و سستی سے بہت بچنا چاہیئے، کیوں کہ کاہل آدمی خالق اور مخلوق دونوں کے سامنے ذلیل رہتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''عقل مند وہ شخص ہے جو نفس کی نگرانی رکھتا اور مرنے کی بعد کی تیاری میں رہتا ہے، اور عاجز و کاہل وہ شخص ہے جو نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا اور (عبادت و مغفرت کے معاملے میں) اللہ تعالیٰ سے بس امیدیں لگائے بیٹھتا ہے''۔

(ترمذی:۲۴۵۹)

حاصل یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو اپنی صحت اور تندرستی کا ہمیشہ لحاظ رکھنا اور چاق و چوبند رہنا چاہیئے، تاکہ حق تعالیٰ کی عبادت بہ صد ذوق و شوق اور چستی کے ساتھ انجام دے سکیں، عبادت میں سستی حق تعالیٰ کی بڑی ناقدری اور ان کی احسان ناشناسی ہے۔

۱۲

زیادہ وقت تنہائی میں رہے۔

مثل مشہور ہے ''ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را'' یعنی تنہائی کے مقام پر کوئی آفت نہیں پہونچ پاتی ہے، واقعہ یہی ہے کہ تعلقات کی بہتات آدمی کو بہت خرابیوں میں مبتلا کر دیتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتنوں کی کثرت کے زمانہ میں اس آدمی کی تعریف فرمائی جس کے پاس

چند بکریاں ہوں اور وہ انہیں چرانے کے لئے کسی جنگل یا پہاڑ کے دامن میں چلا جائے صبح سویرے نکل جاتا ہو اور رات دیر گئے گھر پہونچ پاتا ہو۔ (بخاری: ۱/ ۶۹)

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ صحرا کی تنہائی کی وجہ سے شہر کی آفتوں اور اختلاط کے فتنوں سے بالکل محفوظ و مامون رہتا ہے۔

بہر حال آدمی جس قدر بھی تنہائی میں یا اپنے گھر میں رہ سکے تنہا ہی رہ کر ضروری کاموں میں مشغول رہنا چاہیئے، آج تعلقات کی بہتات اور سواریوں کی سہولت نے آدمی کو یکسوئی و جمعیتِ خاطر سے محروم کر دیا، جس کی وجہ سے ہر آدمی لایعنی کے مُضرّ ات میں مبتلا ہو کر ضروری کاموں میں کوتاہ ہو گیا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ جس طرح پہلے زمانہ میں تعلقات کی بہتات یکسوئی اور جمعیت میں حارج ہوا کرتی تھی اس سے زیادہ وہ تنہائی آج خطرناک بن گئی ہے جو موبائل کے ساتھ ہو، بلکہ دیکھا جائے تو ایک موبائیل اور انٹرنیٹ کے مل جانے کے بعد ہر قسم کے تعلقات کی کثرت خود بہ خود ہو جاتی ہے، اس تنہائی سے تو چار آدمیوں میں رہنا بہتر ہے، کیوں کہ آج نوجوانوں بلکہ معمّر لوگوں کو بھی جو تعلق موبائل فون میں موجود آزاد فیوچرز سے ہو گیا ہے وہ نہ صرف ضروری کاموں اور ذمہ داریوں میں حارج ہوتا ہے بلکہ رفتہ رفتہ حیاسوز و مُخربِ اخلاق بھی ہو جاتا ہے۔ شریف الطبع اور شرمیلے مزاج کے لوگوں کے لئے تو اور زیادہ نقصان دہ ہے کیوں کہ یہ لوگ طبعی شرافت اور شرمیلے پن کی وجہ سے کُھلے عام ہونے والی بے حیائیوں سے بہت ہی دور اور محفوظ رہا کرتے تھے، مگر تنہائی کے یہ کلب اور سنیما انہیں بھی خوگرِ بے حیائی بنا دیتے ہیں، جب موقع ملے تنہائی کا کوئی گوشہ اختیار کر لیا اور اچھے کام کرتے کرتے فحش و حیا سوز سائٹس میں نکل جاتے اور دامنِ تقویٰ و طہارت کو داغ دار بلکہ تار تار کر آتے ہیں، تو ایسے لوگوں کے لئے تنہائی کیا مفید ثابت ہو سکتی ہے، ایسے لوگوں کا بہ جائے تنہائی کے بال بچوں کے ساتھ مشغول رہنا زیادہ مناسب ہے، اگر چہ تنہائی کی برکتوں سے محروم رہیں گے مگر موبائیل کے زہر سے محفوظ ہو جائیں گے، قاعدہ ہے کہ حالات کے بدلنے سے

احکام بدلتے ہیں، اسی قاعدہ کے رُو سے میں نے حضرتؒ کی اس ہدایت میں حالاتِ زمانہ کی روشنی میں یہ وضاحت بڑھادی ہے۔

یہ عوام الناس کے لئے ہے، باقی جہاں تک دُعاۃ وعلماء، مدرسین و مصلحین کی بات ہے تو انہیں اگرچہ عوام الناس اور مجامع میں ہی زیادہ رہنا ہوتا ہے اور رہنا ضروری بھی ہے لیکن انہیں چاہئے کہ اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے انٹرنیٹ سے پاک خلوت میں گذار کر یادِ الٰہی کا شرف حاصل کرتے رہیں، انابت ومناجات کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں، نیز جلوت کی کوتاہیوں کا استحضار کر کے استغفار کرتے رہیں، یہ سب کے لئے بہت ضروری کام ہے۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (سورۃ الم نشرح: ۷،۸)

لہٰذا جب تم فارغ ہوجاؤ تو (عبادت میں) اپنے آپ کو تھکاؤ، اور اپنے پروردگار ہی سے دل لگاؤ۔

۱۳

اگر اَوروں سے ملنا جُلنا پڑے تو سب سے عاجز ہو کر رہے، سب کی خدمت کرے، بڑائی نہ جتلائے۔

انسان تجرّد وتنہائی سے وحشت محسوس کرتا ہے، زیادہ دیر اکیلا نہیں رہ سکتا، کسی نہ کسی عُنوان سے اوروں سے ملتے جُلتے رہنا پڑتا ہے، کبھی ازدواجی اور گھریلو تعلقات کا سامنا رہتا ہے تو کبھی کاروبار اور معاملات ومعاشرت کے حوالے سے لوگوں سے رابطہ رہتا ہے، غرض میل جول اور معاشرتی ومُدنی روابط سے کسی کو چھٹکارا نہیں ہے، جب یہ بات ہے تو ان تعلقات کو

خرابی سے بچانے اور نااتفاقی و ناخوش گواری کے اسباب سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی کسی ضابطۂ اخلاق اور آداب کی سخت ضرورت پڑتی ہے، اسلام نے اس سلسلے میں خصوصی ہدایات دی ہیں، جو یقیناً سینکڑوں سے متجاوز ہیں، بلکہ معاملات و کاروبار کے جتنے احکام ہیں وہ سب انسانی برادری کو ہر ممکن نااتفاقی و ناگواری سے بچائے رکھنے کے لئے ہی ہیں، اور معاشرتی آداب کا مقصد بھی معاشرۂ اسلامی کو ذہنی، جسمانی و قلبی اذیتوں سے محفوظ رکھنا ہی ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۰﴾ (سورۃ الحجرات:۱۰)

حقیقت تو یہ ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، اس لئے اپنے دو بھائیوں کے درمیان تعلقات اچھے بناؤ، تاکہ تمہارے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما تواضع احد للہ الا رفعہ اللہ (مسلم:۲۵۸۸)

کوئی شخص اللہ کے واسطے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کو سربلند کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں فرمایا: ”بدگمانی سے بچو، اس لئے کہ بدگمانی بدترین جھوٹ ہے، عیبوں کی ٹوہ میں نہ رہو، تجسس مت کرو، کسی کی بولی پر بولی مت لگاؤ، حسد نہ کرو، بغض نہ رکھو، اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو“۔ (بخاری:۶۰۶۴)

اس حدیث میں عباد اللہ کے ذریعہ مخاطب کرکے امن وامان اور باہمی اطمینان واعتماد کی جڑ کی طرف اشارہ فرمادیا کہ لوگ اپنے بندہ ہونے پر نظر رکھیں اور بندہ پن اپنالیں تو کبھی اُن کے درمیان نااتفاقی کی صورت ہی پیدا نہ ہو، کیوں کہ معاشرہ کا سارا فساد اور نااتفاقیوں کی جڑ بنیاد بندہ پَن کے بجائے خداپَن اختیار کرنے کی وجہ سے ہے۔ حضرتؒ فرمارہے ہیں کہ مسلمان جب اجتماعی زندگی گذار رہے ہوں تو بندہ پَن کے ساتھ رہیں ”سب سے عاجز ہو

کررہیں'' کا یہی مطلب ہے، اوراسی کی تشریح وتائید میں دو جُملے اورفرمائے کہ ''سب کی خدمت کرے، بڑائی نہ جتلائے''۔ واقعی ہے تو یہ بہت چھوٹی سی بات مگر بڑے کام کی اور بہت نفع کی بات ہے، آج اگرایسا طرزِ عمل اختیار کرلیں تو لوگ ایک دوسرے کومحبت و پیار کی نظر سے دیکھنے لگیں اورنفرتوں اوروحشتوں کا ماحول ہی ختم ہوجائے۔

۱۴

اور مال داروں سے تو بہت ہی کم ملے۔

دیکھئے! نہ مال بُری چیز ہے نہ مال دار قابلِ نفرت ہے، مال کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا (سورۃ النساء:۵) وہ مال جس کواللہ نے تمہارے لئے زندگی کا سرمایہ بنایا ہے۔

اور مال دار لوگ تو ناداروں کے لئے سایۂ شفقت اورسرپرست ہیں تو نہ مال بُرا ہے نہ مال دار بُرا، البتہ نفسیاتی طور پر انسان کے اندر کچھ ایسی صفات ہیں جن کے لئے مال بھی مُضر ہے اور مال دار کی صحبت بھی۔ اس لئے حکیم الامتؒ نے اُمت کواس سے منع فرمایا ہے، حدیث شریف سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی دین میں تواپنے سے فائق اور بلند لوگوں کو دیکھا کرے اوران کی صحبت اختیار کیا کرے کیوں کہ اس سے ان جیسے بننے کی حرص پیدا ہوتی ہے اور دنیا کے معاملے میں اپنے سے کم تر اور کم زور لوگوں پرنظر کرے اوران کی صحبت میں رہا کرے تاکہ اپنی بہتر حالت پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاسکے اوراپنی نعمتوں کی قدر کرسکے۔

(مسلم: ۲۹۶۳)

اس کے برخلاف اگر آدمی دین میں اپنے سے کم تر لوگوں کو دیکھا کرے گا تواپنی

عبادت وتدیُّن پر غرور کرتے ہوئے بندگانِ خدا کی تحقیر کا مجرم بنے گا اور دنیا میں اپنے سے برتر اور مال دار لوگوں کو پسند کرے گا اور ان کی صحبت اختیار کرے گا تو لازماً ناشُکرا پَن، حرص و طمع اور احساسِ کم تری کا شکار ہوگا اور یہ سب ناپسندیدہ ومبغوض صفات ہیں، اس لئے مال داروں کو حقیر سمجھے بغیر اور اُن کی بُرائی کئے بغیر اپنے کو ان کی صحبتوں سے دور اور محفوظ رکھا کرے، یہ بہت اہم نصیحت ہے، ہاں! اہلِ علم اسی طرح داعی حضرات اُن کی دولت سے مکمل استغناء اور پوری احتیاط رکھتے ہوئے محض دعوتِ دین اور نصیحت وخیر خواہی کے لئے ملاقات کریں اور صرف اُن کے دین کی خاطر مناسب حد تک تعلقات رکھیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس تفصیل سے امید ہے کہ ہدایت نمبر ۱۴ میں کوئی اشکال بھی نہ رہے گا اور اس ہدایت کی حکمت بھی اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی۔

۱۵

بددین آدمی سے دور بھاگے۔

یعنی کُھلے عام فسق وفجور میں مبتلا رہنے اور شرعی احکام کی آزادانہ خلاف ورزی کرنے والوں سے، اسی طرح عقائد میں اہل السنۃ والجماعت کی مخالفت کرنے والوں سے جس قدر ممکن ہو محتاط اور ان سے دور رہنا چاہیئے، اس لئے کہ اپنے دین کا تحفظ اس احتیاط کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

قرآن کریم میں حق تعالیٰ شانہٗ ایک بدنصیب کا ذکر کرتے ہوئے ــــ جو محض دوستوں کی خاطر حق واضح ہوجانے اور سمجھ میں آجانے کے بعد بھی کفر پر قائم رہا تھا ــــ فرمایا کہ کل قیامت میں وہ اپنے شقی وبدبخت دوستوں کی دوستی پر کفِ افسوس ملے گا اور ہونٹ چبائے گا۔

يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

(سورۃ الفرقان: ۲۸،۲۹)

ہائے میری بربادی! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا!، میرے پاس نصیحت آچکی تھی، مگر اس (دوست) نے مجھے اُس سے بھٹکا دیا، اور شیطان تو ہے ہی ایسا کہ وقت پڑنے پر اِنسان کو بے کس چھوڑ جاتا ہے۔

اسی طرح منافقین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ

(سورۃ النساء: ۱۴۰)

اور اس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جارہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جارہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک مت بیٹھو جب تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں، ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔

ایک اور جگہ پر فرمایا:

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

(سورۃ ھود: ۱۱۳)

اور (مسلمانو!) اِن ظالم لوگوں کی طرف ذرا بھی نہ جھکنا، کبھی دوزخ کی آگ تمہیں بھی آپکڑے، اور تمہیں اللہ کو چھوڑ کر کسی قسم کے دوست میسر نہ آئیں، پھر تمہاری کوئی مدد بھی نہ کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

الرجل علی دین خلیله ، فلینظر احدکم من یخالل (ابوداؤد:۵/۱۶۵)	آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے اس لئے تم میں سے ہر ایک اس پر نظر رکھے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’دوستی صرف صاحبِ ایمان سے کرو اور اپنا کھانا نیک لوگوں کو کھلاؤ‘‘ (ترمذی:۴/۵۱۹)

ظاہر ہے کہ جب نیک لوگوں سے ہی دوستی ہوگی تو کھانا پینا اور اُٹھنا بیٹھنا زیادہ تر انہی کے ساتھ رہے گا اس طرح بددین لوگوں کے بُرے اثرات سے محفوظ رہے گا۔

ایک حدیث میں بُری صحبت کی مثال دیتے ہوئے فرمایا: ’’بُرے ساتھی کی مثال بھٹی دھونکنے والے کی ہے کہ اگر تم اس کی صحبت میں جاؤ گے تو یا تو (آگ کی چنگاریوں سے) کپڑے جلیں گے یا کم ازکم (دُھویں کی) بدبو اور کالک تو ملے گی ہی‘‘۔ (بخاری:۹/۶۶۰)

یہ اور ان جیسی متعدد آیات واحادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اگر اپنا دین وایمان محفوظ رکھنا ہے تو دین پسند اور اچھے خیالات کے لوگوں کے ساتھ رہنا اور دین بیزار وملحدانہ خیالات ونظریات کے حاملین سے دور بھاگنا اور علاحدہ رہنا اشد ضروری ہے، ورنہ اُن کی گم راہیوں اور بدعملیوں سے خود کو بچانا ناممکنات میں سے ہو جائے گا۔

اس جگہ بھی یہ بات ملحوظ رہنی چاہیئے کہ بے دینوں سے دور بھاگنا اور دامن بچائے رکھنا اگرچہ بہت ضروری ہے لیکن اُنہیں حقیر سمجھنا اور ان کے مقابلے میں اترانا اور گھمنڈ کرنا بالکل جائز نہیں ہے، کیوں کہ ہماری ہدایت ہمارا کمال نہیں ہے حق تعالیٰ کی عطا ہے، تمام انسانوں کے قلوب حق تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہے جدھر چاہے پھیر سکتا ہے، کتنی دفعہ دنیا میں دیکھا گیا ہے کہ اچھے اچھے دین دار بھی بے دین بن گئے اور کیسے کیسے گم راہ راہِ حق وہدایت کے راہی ہو گئے، پس حق تعالیٰ کی شانِ استغناء سے اپنے سوءِ خاتمہ سے ڈرتے بھی رہنا چاہیئے، اور گم راہیوں کی ہدایت کے لئے دعا گو بھی رہنا چاہیئے، اور ان کے ضرر اور شر سے بچنے کے لئے اُن سے دور بھی رہنا چاہیئے۔

۱۶

دوسروں کے عیب نہ ڈھونڈے، کسی سے بدگمانی نہ کرے اپنے عیبوں پر نظر رکھے، اور ان کی درستی کیا کرے۔

بارہویں ہدایت سے یہاں تک گویا ایک تسلسل ہے، سب سے پہلے تو آدمی حتی المقدور گم نامی اور گوشہ نشینی ہی کو ترجیح دے، پھر اس کے بعد جس قدر بھی اجتماعی زندگی میں شمولیت ہو تو غرور و تکبر کے بجائے تواضع، خدمت گذاری اور بے آزاری کے ساتھ رہے، پھر اجتماعیت میں بھی مال داروں سے بالقصد زیادہ روابط نہ رکھے، اور سماج میں جو لوگ بے دین و بدعقیدہ ہوں ان سے دور رہنے ہی میں عافیت محسوس کرے، اور اب بتا رہے ہیں کہ اجتماعی زندگی میں دوسروں کو اپنے ضرر سے بچانے اور ناخوش گوار حالات سے خود بھی محفوظ رہنے کا راستہ یہی ہے کہ بدگمانی اور تجسُّسِ عیوب سے بچتا رہے، بدگمانی اور بدزبانی بدمزاجی کا سبب بنتی ہے، دوسروں کے عیوب پر نظر ان کی تحقیر و تنقیص پر اُبھارتی ہے، نیز اس کی نحوست سے خود کے عیبوں کی طرف سے دھیان ہٹ جاتا ہے جو نخوت، کبر اور خود پسندی جیسی بیماریوں کو جنم دیتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا (سورۃ الحجرات: ۱۲)

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگو۔

آیتِ شریفہ میں دونوں باتیں آگئیں، بدگمانی اور عیب جوئی، ان باتوں سے بچنے کا حکم

خود ان کے مذموم ہونے کے لئے کافی ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ان بُری باتوں کی مذمت منقول ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث، ولاتحسسوا ولاتجسسوا (بخاری: ۱۰/ ۴۸۴)	تم بدگمانی سے بچو، اس لئے کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، اور لوگوں کے عیوب کی تلاش میں نہ رہو۔

اس کے برخلاف لوگوں کی برائیاں ہمیں معلوم بھی ہوجائیں تو ان کی پردہ پوشی کرنا چاہیئے، ارشاد ہے:

من ستر مسلما سترہ اللہ یوم القیامۃ (بخاری: ۵/ ۹۷)	جو کسی مسلمان کے عیوب چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کے عیوب چھپائیں گے۔

دوسروں کے عیوب ڈھونڈھنا اور پھیلانا تو مذموم اور بُری حرکت ہے لیکن اپنے عیوب پر نظر رکھنا اور ان کی اصلاح کی فکر کرنا محمود اور پسندیدہ عمل ہے، واقعہ یہ ہے کہ آدمی اگر اپنے عیوب پر نظر رکھے رہے تو اُن کی فکر اور اُن پر شرمندگی اس کو دوسروں کے عیوب کی طرف توجہ دینے اور اُن پر ہنسنے کا موقعہ ہی نہیں دے گی، حضرت حکیم الامتؒ نے ہی ایک موقعہ پر بڑی اچھی تشبیہ دی، فرمایا: ''جذامی کیا ہنسے زکامی پر؟'' یعنی ایک شخص جو جذام جیسے خطرناک مرض میں مبتلا تھا اس کو ایک زکامی نظر آیا جو سردی اور نزلہ میں مبتلا تھا تو اُسے دیکھ کر موصوف ہنسنے اور مذاق اُڑانے لگے، کسی اور نے توجہ دلائی کہ جناب! آپ خود ایک خبیث وقابل نفرت مرض میں مبتلا ہیں، ہر دیکھنے والا کراہت کر رہا ہے اور دور بھاگ رہا ہے، اپنے اس خطرناک مرض پر تو آپ کی نظر نہیں اور دوسروں کے معمولی مرض کی تحقیر کر رہے ہیں، یہی حال ہم لوگوں کا ہے کہ تکبر، ریاء، حسد، بغض وغضب اور نہ جانے کیسے کیسے بدترین روحانی واخلاقی امراض کے شکار رہنے کے باوجود دوسروں کی معمولی معمولی کوتاہیوں اور خطاؤں کے پیچھے پڑے ہوئے

ہیں، اس مزاج کو بدلنے کی ضرورت ہے تاکہ اپنے عیوب کی اصلاح و درستگی کی راہیں بھی نکلیں اور دوسروں کی تحقیر کے جرم سے بھی بچ جائیں، حضرت حکیم الامت رحؒ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''ہمیشہ اسی اُدھیڑ بُن میں رہتا ہوں کہ اپنے فلاں حال کی کیسے اصلاح ہو اور فلاں کی کیسے؟ سُبحان اللہ کیا مقام ہے؟

۱۷

نماز کو اچھی طرح، اچھے وقت، دل سے پابندی کے ساتھ ادا کرنے کی فکر کرے۔

کون نہیں جانتا کہ نماز افضل العبادات ہے، اور اس کا ایمان کے ساتھ خاص رشتہ ہے، بلکہ بعض علماء کے نزدیک نماز کے بغیر ایمان کا تصور بھی مشکل ہے، قرآن کریم میں ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٣١﴾ (سورۃ الروم)

اور نماز قائم کرو، اور ان لوگوں کے ساتھ شامل نہ ہو جو شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔

حدیث میں فرمایا گیا:

بین العبد و الکفر ترک الصلوٰۃ (مسلم: ۱/۸۸)

آدمی اور کفر کے درمیان بس نماز کا چھوٹ جانا ہے۔

اس قسم کی نصوص کی وجہ سے مسلمانوں کو نماز کی اہمیت اور وقعت کا خوب اندازہ ہے اور بہت سے مسلمان خصوصاً دین دار کہلائے جانے والے مسلمان نماز پابندی سے پڑھتے ہیں، یہاں حضرت رحؒ نے نماز کو صفاتِ مطلوبہ کے ساتھ ادا کرنے اور منافقین والی نماز سے اجتناب کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے، یعنی ''اچھی طرح، اچھے وقت، دل سے، پابندی کے ساتھ''

نماز ادا کرنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

اچھی طرح کا مطلب تمام سُنتوں کی رعایت کرتے ہوئے شرائط و فرائض کی تکمیل کرنا؛ **اچھے وقت** کا مطلب مستحب اوقات کی رعایت رکھتے ہوئے ادا کرنا، قضاء تو بالکل نہ ہونے دینا؛ **دل سے** کا مطلب خشوع و خضوع اور جذباتِ عبودیت و بندگی کے ساتھ ادا کرنا، دل کا نماز کی طرف متوجہ رہنا اِدھر اُدھر نہ لگنا؛ **پابندی کے ساتھ** کا مطلب روزانہ پڑھنا، پانچوں وقت پڑھنا؛ یعنی چھوڑ پکڑ نہ کرنا، پابندی کرنا، کبھی ناغہ نہ کرنا، ان سب باتوں کی طرف کتاب وسنت میں جگہ جگہ متوجہ کیا گیا ہے۔ مثلاً

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴿۲۳۸﴾ (سورۃ البقرہ: ۲۳۸)
اور اللہ کے سامنے باادب فرماں بردار بن کر کھڑے رہو۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ (سورۃ ھود: ۱۱۴)
اور (اے پیغمبر!) دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرو۔

ایک موقعہ پر کامیاب ہونے والے مومنین کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿۲﴾ (سورۃ المومنون)
ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے جو اپنی نماز میں دل لگانے والے ہیں۔

ایک اور جگہ پر بُرے لوگوں کی تنبیہ کے بعد فرمایا:

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ (سورۃ المعارج)
مگر وہ نمازی ایسے نہیں ہیں جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

خمسُ صلَواتٍ افترضهُنَّ اللّٰهُ تعالَى مَنْ أَحسَنَ وُضوءَهُنَّ وَصلَّاهُنَّ لِوَقتِهِنَّ وَأَتَمَّ رُكوعَهُنَّ وَخُشوعَهُنَّ
پانچ نمازیں جن کو اللہ تعالیٰ نے فرض فرمایا ہے، جو ان کے لئے اچھی طرح وضو کرے، ان کو ان کے وقت پر ادا کرے

كَانَ لَهُ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ أَنْ يَغْفِرَ لَهُ، وَمَنْ لَمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهُ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ، إِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُ وَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهُ (ابوداؤد: ۱/ ۲۹۵)

اور رکوع مکمل کرے، خشوع وخضوع کا اہتمام رکھے، تو اللہ نے اس بندے کو معاف کرنا اپنے ذمّے لے لیا ہے، اور جو ایسا نہ کرے، اللہ پر کوئی ذمہ داری نہیں، چاہے تو اُسے معاف فرمائے یا اُسے عذاب دے۔

اس میں سب باتیں آگئیں، خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی پابندی مومن کے لئے نہایت ضروری امر ہے، اور محض زبردستی کی ادائیگی کافی نہیں ہے، دل وجان اور ذوق وشوق سے پڑھنا بھی لازم ہے، پس اس کے طریقے علماء سے معلوم کر کے اپنی نمازوں کو حقیقی اور مقبول ومعتبر نمازیں بنالینے کا اہتمام کرلینا چاہیئے۔

۱۸

دل یا زبان سے ہر وقت اللہ کی یاد میں رہے، کسی وقت غافل نہ ہو۔

یادِ الٰہی تو کون نہیں جانتا کہ مقصودِ حیات ہے، اور سب سے بڑا عمل ہے، ارشاد ربانی ہے:

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط (سورۃ العنکبوت: ۴۵)

اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج

(سورۃ الِ عمران: ۱۹۱)

۔۔(ان عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں) جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں۔

نیز مغفرت اور اجرِ عظیم کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

(سورۃ الاحزاب: ۳۵)

اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد ہوں یا ذِکر کرنے والی عورتیں، ان سب کے لئے اللہ نے مغفرت اور شاندار اَجر تیار کررکھا ہے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ذکر کی اہمیت کی طرف بہت توجہ دلائی ہے، بے شمار احادیث ذخیرۂ احادیث میں موجود ہیں، ایک حدیث درج کی جاتی ہے:

أَلَا أُنبئُكُمْ بِخَيرِ أَعْمالِكُمْ، وَأَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيكِكُمْ، وَأَرْفَعِهَا فِي دَرَجَاتِكُمْ، وَخَيرٍ لَكُمْ مِنْ تَعَاطِي الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَمِنْ أَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ غَدًا فَتَضْرِبُوا أَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوا أَعْنَاقَكُمْ؟ قَالُوا: بَلٰى، يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ: ذِكْرُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔

(ترمذی: ۵/۱۲۷)

کیا میں تم کو ایسے عمل کی خبر دوں، جو سب سے بہتر ہے، تمہارے بادشاہ (یعنی اللہ تعالیٰ) کے ہاں سب سے زیادہ پاکیزہ ہے، تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا ہے، تمہارے لیے سونے اور چاندی کا صدقہ کرنے سے بھی بہتر ہے اور تمہارے لیے اس عمل سے بھی بہتر ہے کہ تمہاری اپنے دشمنوں سے ٹکر ہو اور تم ان کی گردنیں کاٹو اور وہ تمہاری گردنیں کاٹیں؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! ضرور بتلائیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ عمل اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

مثل الذی یذکر ربه والذی لایذکر مثل الحی والمیت (بخاری:۱۱/ ۲۰۸)	اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندے اور مُردے کی سی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی غور کرنے کی چیز ہے کہ عبادات اسلامی میں نماز کا مقصد ذکر ہی بتلایا گیا ہے: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ، جمعہ سے فراغت کے بعد ذکر کا حکم ہے، وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا ، حج میں عرفات سے فراغت کے بعد ذکر کا حکم دیا گیا، فَاِذَا قَضَیۡتُمۡ مَّنَاسِکَکُمۡ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ، مزدلفہ میں ذکر ہی کا حکم ہے، فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ، جہاد میں بھی ذکر کی تاکید کی گئی ہے فَاِذَا قَضَیۡتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِکُمۡ۔ فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ

پھر علی الاطلاق کثرتِ ذکر کی ترغیب بلکہ تاکید کی گئی ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡکُرُوا اللّٰہَ ذِکۡرًا کَثِیۡرًا ﴿۴۱﴾ (سورۃ الاحزاب)	اے ایمان والو! اللہ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں ذکر اللہ اور یادِ الٰہی کی بڑی اہمیت ہے، مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کی طرف خصوصی توجہ دیں کبھی یادِ الٰہی سے غافل نہ ہوں۔

۱۹

اگر اللہ تعالیٰ کا نام لینے میں مزہ آئے اور دل خوش ہو تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے۔

یہ ہدایت نمبر ۱۸ ہی کا تتمہ ہے کہ ذکر کی توفیق ہو جانا اور اس میں دل لگنا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس لئے اس پر اللہ تعالیٰ ہی کا شکر بجالانا چاہیئے، کیوں کہ ذکر میں علاوہ

اجر و ثواب کے ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اپنے ذاکر بندے کا ذکر فرماتے ہیں اور اس سے بہتر مجمع میں فرماتے ہیں فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

ایک حدیث قدسی میں ہے:

انا عند ظن عبدی بی، وانا معه اذا ذکرنی، فان ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی، وان ذکرنی فی ملأ ذکرته فی ملأ خیر منهم

(بخاری: ۱۳/ ۳۸۴)

میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں، اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرے، پس اگر وہ مجھے تنہائی میں یاد کرے تو میں بھی اس کو تنہائی میں یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ مجھے مجمع میں یاد کرے تو میں اس کو اس سے بہتر مجمع میں یاد کرتا ہوں۔

اسی لئے حضرت حکیم الامت ؒ ''مسائل السلوک'' فرماتے ہیں: هذه ثمرة اصلية من هذا الذكر یعنی ذکر کی عبادت کا اعلیٰ اور لذیذ ترین ثمرہ تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ذکر فرماتے ہیں: فطوبیٰ للذاکرین۔

۲۰

بات نرمی سے کرے۔

باتیں تو آدمی کرتا ہی ہے مگر بات میں سلیقے کی بڑی اہمیت ہے، ایک ہی بات کسی انداز سے کُلفت اور تکلیف کا سبب بن جاتی ہے کسی اور انداز سے وہی بات راحت و مسرت کا پیغام ہو جاتی ہے؛ اس کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے بد بخت مدّعیِ خدائی کے پاس دعوتِ ایمان کے لئے بھیجا تو یہ بھی

تاکید فرمادی کہ

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾ (سورۃ طٰہٰ: ۴۴)

جاکر دونوں اُس سے نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے، یا (اللہ سے) ڈر جائے۔

معلوم ہوا کہ نرم گفتاری بڑے سے بڑے سرکش ونافرمان پر بھی اثر انداز ہوسکتی ہے، اس کے برخلاف سخت کلامی اور تُرش گفتاری اچھے سے اچھے شریف انسان کو نافرمانی وبغاوت پر مجبور کرسکتی ہے، یہ آیت بتلارہی ہے کہ کسی سے نصیحت قبول کروانے یا بُرے انجام سے ڈرانے کا ذریعہ نرم گوئی ہی ہوسکتا ہے، ورنہ اللہ پاک اس قدر اہتمام سے پیغمبروں کو کیوں پابند کرتا؟

عام اہل کتاب سے گفتگو کے سلسلے میں امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی یہی ہدایت دی گئی ہے، فرمایا:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (سورۃ النحل: ۱۲۵)

اُن سے بحث بھی ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو۔

حُسنِ گفتار کے فوائد کو بتلاتے ہوئے ارشاد ہوا:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ (سورۃ فصلت: ۳۴)

تم بدی کا دفاع ایسے طریقہ سے کرو جو بہترین ہو، نتیجہ یہ ہوگا کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا ہوجائے گا جیسے وہ (تمہارا) جگری دوست ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس صفت پر خود تو عمل کیا ہی مسلمانوں کو بھی باربار تاکید فرمائی ہے، اور مختلف انداز سے کی ہے، ایک موقع پر چند اچھی صفات کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

ولینوا الکلام　　　　اور گفتگو نرمی سے کیا کرو۔

صدیقِ اکبرؓ سے ایک شخص بحث وتکرار کر رہا تھا، آپ ﷺ یہ گفتگو سُن رہے تھے، جب صدیقِ اکبرؓ نے اس کی کسی سخت کلامی کا جواب سخت کلامی ہی سے دیا، تو آپ اُٹھ کر جانے لگے، صدیقِ اکبرؓ کے پوچھنے پر بتلایا' جب تک تم سخت کلامی سے بچ رہے تھے تو اس کے جواب کے لئے ایک فرشتہ مامور کیا گیا تھا، مگر جب تم نے اپنی زبان کو سخت کلامی کے لئے استعمال کرلیا تو فرشتہ چلا گیا''۔

سیدنا عمر فاروقؓ کے ایک دفعہ ایک یہودی کو سخت بات بولنے پر آپ ﷺ ناراض ہوئے اور اس یہودی کو عمر فاروقؓ کی سخت کلامی کے بدلے میں بیس سیر کھجوریں اس کے حق سے زائد دینے کا حکم فرمایا۔

بہر حال سخت کلامی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ دونوں کو ناپسند ہے، اسی لئے مسلمانوں کے لئے بھی ناپسند کیا گیا ہے، اس کے بجائے نرم گوئی اور حُسنِ کلام کی ترغیب وتاکید فرمائی گئی ہے، اس لئے مسلمانوں کو اپنے اندر صبر وحلم اور نرم گفتاری کی صفت پیدا کرلینی چاہیئے، حتیٰ کہ جو شخص بدکلامی کرے اس کے ساتھ بھی خوش گفتاری سے پیش آنا چاہیئے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

احسن الی من أساء الیک　　　　جو تم سے بدسلوکی کرے تم اس سے حسنِ سلوک کرو۔

یعنیبدسلوکی اور بدزبانی کا جواب اچھے سلوک اور خوش کلامی سے دو۔

۲۱

سب کاموں کے لئے وقت مقرر کرے اور پابندی سے اس کو نبا ہے۔

وقت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، دنیا کے تمام عقلاء نے وقت ہی کو سب سے بڑی پونجی قرار دیا ہے، مگر اکثر اس کی قدر نہیں کرتے، ایک حدیث میں ہے کہ :

نعمتان مغبون فیھما کثیر من الناس الصحۃ والفراغ (بخاری:۱۱/۲۲۹)	دو نعمتیں ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ (ان کی کما حقہ قدر نہ کرنے کے سبب) خسارہ اور نقصان میں ہیں: صحت اور فراغ۔

حالاں کہ اسلام نے وقت کی قدردانی کی ہدایت بھی دی ہے اور اپنی تعلیمات میں اس کا عملاً لحاظ بھی رکھا ہے، مثلاً

نماز کے اوقات مقرر کئے، ایک خاص ترتیب کے ساتھ ان کے درمیان فاصلہ متعین کیا اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا, زکوۃ کی فرضیت کے لئے ایک وقت مقرر کیا کہ جب مخصوص مقدارِ مال پر سال گذر جائے تو زکوۃ واجب ہوتی ہے۔

روزہ میں امساک اور افطار کا وقت متعین فرما دیا گیا، نیز روزہ رکھنے کے ایام متعین کئے حج کے لئے مہینہ بھی مقرر فرما دیا اور اس کے مناسک و مراسم ادا کرنے کے اوقات بھی متعین فرمائے گئے۔ خلاصہ یہ کہ اسلام نے غیر منظّم اور غیر مہذب زندگی کو اپنے ماننے والوں کے لئے بالکل پسند نہیں کیا ہے۔

شخصی طور پر جب تک آدمی اپنے شب و روز کا نظام العمل نہیں بنا لیتا کام نہیں کر پاتا،

اسی لئے جولوگ نظام الاوقات یعنی ٹائم ٹیبل بنا کراس کے مطابق چلتے ہیں ان کے اوقات میں بہت برکت ہے، وہ انہی چوبیس گھنٹوں میں اتنا کام کرلیتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے، اور جولوگ بے نظام جیتے ہیں ان کے روزانہ کے ضروری کام بھی پورے ہونے سے رہ جاتے ہیں، کسی نے خود حضرت حکیم الامتؒ سے پوچھا تھا کہ وہ اتنے سارے کام کیسے کرلیتے ہیں؟ فرمایا کہ میں نے ہر کام کے لئے وقت مقرر کر رکھا ہے، اس کی برکت سے تمام کام وقت پر ہو جاتے ہیں۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا میں جتنے بڑے لوگ کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں خواہ دین کے خواہ دنیا کے وہ سب اپنے اوقات بہت ہی حساب وکتاب اور نظم وضبط سے استعمال کرتے ہیں۔

لیکن عام طور سے مسلمان کیف ما اتفق یعنی بے نظم ہی صبح وشام کرتے ہیں جس کے نتیجے میں اوقات بہت برباد ہوتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے اوقات کی تنظیم وتقسیم کرکے صبح وشام کا ایک خاکہ تیار کرلیں، پھر اہتمام سے اس پر عمل کریں اور بغیر کسی خاص ضرورت کے اس کی خلاف ورزی ہرگز نہ کریں، زیادہ نہیں ایک ہفتہ تجربہ کرکے دیکھ لیں کہ وقت میں کس قدر برکت ہوتی ہے اور تمام ضروری کام کتنی آسانی سے تکمیل کو پہونچ جاتے ہیں۔

اسی کے ساتھ نظام العمل کی پابندی کرنے والا آدمی ہر قسم کے لغو ولایعنی کاموں سے بچ جاتا ہے، کیوں کہ اس کے پاس ہر کام کے لئے وقت متعین ہے اگر وہ آگے پیچھے کرے گا تو سارا نظام خراب ہوگا، اس لئے وہ بے جا مداخلت کرنے والوں سے ہر ممکن فاصلہ بنائے رکھتا ہے، آج کل کاموں میں مداخلت کرکے کام کو سب سے زیادہ خراب کرنے والا ''موبائیل'' ہے، اس کے ضرر سے بھی محفوظ رہے گا، البتہ ایسی پابندی جس سے اہلِ حقوق کی حق تلفی ہو جائے یہ مناسب نہیں ہے، بہرحال تضییعِ اوقات سے بچنے کی آسان صورت اوقات کی تقسیم وتعیین ہے۔

۲۲

جو کچھ رنج وغم اور نقصان پیش آئے اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانے، پریشان نہ ہو اور یوں سمجھے کہ اس میں مجھ کو ثواب ملے گا۔

جس جگہ کوئی راحت نہیں وہ جہنم ہے، جس جگہ کوئی تکلیف نہیں وہ جنت ہے، اور یہ دونوں دارالجزاء ہیں، ان کے برخلاف یہ دنیا دارالامتحان اور دارالعمل ہے، یہاں مختلف حالات پیش آتے رہتے ہیں طبیعت کے موافق بھی خلاف بھی، خوشی ومسرت کے بھی غم واندوہ کے بھی، کبھی کوئی پیدا ہوتا ہے تو کوئی مرتا بھی ہے، فائدہ ہے تو نقصان بھی ہے، عزت ہے تو ذلت بھی ہے، صحت ہے تو بیماری بھی ہے، فراخی وخوش حالی ہے تو تنگی وجز معاشی بھی ہے، انبساط ہے تو انقباض بھی ہے، غرض اس جہاں میں کسی حالت کو قرار واطمینان نہیں ہے، بندے دونوں قسم کے حالات سے گذارے جاتے ہیں، یہ فطرت کا نظام ہے جو ابتداء سے قائم ہے اور کارخانۂ عالم کے قیام تک قائم رہے گا۔

جب یہ بات ہے تو پھر آدمی کی عقل مندی یہ ہے کہ جب کوئی نعمت ملے اور دلی تمنا پوری ہو تو مغرور نہ بنے کسی فریب میں مبتلا نہ ہو اور کوئی مصیبت اور ناموافق صورتِ حال سامنے آئے تو شکستہ دل اور مایوس نہ ہو، بھلی بُری ہر حالت کو حق تعالیٰ کی تقدیر کے تابع سمجھ کر خوش دلی اور اطمینانِ قلبی کے ساتھ اس کا سامنا کرے، موافق حالت پر شکر بجالائے ناموافق پر صبر وثبات کا ثبوت دے، مصائب آلام اور نقصانات کے موقع پر قضاء وقدر کے برحق ہونے کا اعتقاد بہت کار آمد ثابت ہوتا ہے، ایسے مواقع پر کان امر اللہ قدرا مقدورا پر غور کر کے

راضی بہ رضا رہنا چاہیئے، صبر کے ساتھ ثواب کا استحضار بلکہ یقین بھی رکھنا چاہیئے۔

قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ۝۲۰۷ (سورۃ البقرہ: ۲۰۷)

لوگوں میں بعض وہ بھی ہیں جو اپنی جان بیچ کر اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل کرتے ہیں، اور اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰهِ كَمَنۡۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاۡوٰهُ جَهَنَّمُ‌ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ۝۱۶۲ (سورۃ آل عمران: ۱۶۲)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی چاہتا ہے وہ اس کی طرح ہوسکتا ہے جو غضبِ الٰہی میں جیتا ہے؟ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ ''مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے، اس کا ہر حال بھلا ہے۔۔۔۔جب اس کو نعمت ملتی ہے تو شکر کرتا ہے، شکر اس کے لئے بہتر ہے، اور مصیبت آتی ہے تو صبر کرتا ہے صبر اس کے لئے بہتر ہے۔'' (مسلم: ۴/ ۲۲۹۵)

اس کا مطلب یہی ہوا کہ اچھا بُرا ہر حال مومن کے لئے بہتر ہے بشرطے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جان کر راضی بہ رضا رہے۔ اسی وجہ سے ہم مسلمان جن چیزوں کو مان کر مسلمان ہوئے ہیں ان میں و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ بھی ہے، یعنی اچھا بُرا ہر فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، جہاں تک ثواب کی اُمید رکھنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں یہ حدیث پڑھ لینا کافی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں جب اپنے کسی مومن بندے کی محبوب چیز دنیا کی نعمتوں میں سے لے لیتا ہوں اور وہ میرے فیصلے پر راضی رہتا ہے تو میں جنت سے کم کوئی بدلہ نہیں دیتا ہوں۔ (بخاری: ۱۱/ ۲۴۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مومن کو چاہیئے کہ ہر حال میں راضی بہ رضا رہے اور مشکلات و مصائب میں ثواب کی اُمید پر صابر و ثابت قدم رہے۔

۲۳

ہر وقت دل میں دنیا کا حساب و کتاب اور دنیا کے کاموں کا ذکر مذکور نہ رکھے بلکہ دھیان بھی اللہ ہی کا رکھے۔

نمبر ۱۸ میں ذکر اللہ کی کثرت کی ہدایت دی تھی، یہاں غیر اللہ میں دھیان لگائے رکھنے اور دل میں ہر وقت بجائے اللہ تعالیٰ کے دنیا و مافیہا کے تعلقات، بیوی بچے، مال دولت، جائداد و کاروبار، آپسی معاملات کو غالب رکھنے سے منع فرما رہے ہیں، اس لئے کہ دل اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت اور ایمان و یقین کا محل ہے، جس کے گھر میں اسی کو رہنا چاہیئے، اس لئے دل کو اس کا عادی بنانا چاہیئے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف دھیان رکھے، دوسرے امور کی طرف وقتی طور پر دھیان دے، مستقل طور پر تو اپنے محبوبِ حقیقی اور معبود و مقصود ہی میں مشغول رہے؛ کیوں کہ کسی شخص کے سینے میں بھی دو دل نہیں ہیں، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ج (سورۃ الاحزاب: ۴) — اللہ نے کسی بھی شخص کے سینے میں دو دل پیدا نہیں کئے۔

جب ہمارے سینے میں ایک ہی دل ہے تو یا تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوسکے گا یا غیر اللہ کی طرف، بہ یک وقت دونوں جانب متوجہ ہونا ممکن نہیں، اسی لئے اہلِ ایمان کی شان میں فرمایا گیا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (سورۃ البقرۃ: ۱۶۵) — جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مال و متاع اور جاہ و مرتبہ کی محبت آدمی کی فطرت میں داخل ہے حق تعالیٰ نے خود ہی فرمایا:

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ⑧
(سورۃ العٰدیٰت: ۸)

اور حقیقت یہ ہے کہ وہ مال کی محبت میں بہت پکا ہے۔

اسی طرح فرمایا:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ⑭ (سورۃ آل عمران: ۱۴)

لوگوں کے لئے ان چیزوں کی محبت خوش نما بنادی گئی ہے جوان کی نفسانی خواہش کے مطابق ہوتی ہیں، یعنی عورتیں، بچے، سونے چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں۔ یہ سب دنیوی زندگی کا سامان ہے (لیکن) ابدی انجام کا حسن تو صرف اللہ کے پاس ہے۔

چوں کہ یہ چیزیں آدمی کی مرغوبات میں سے ہونے کے باوجود فانی اور ختم ہوجانے والی ہیں اس لئے عقل مند کے نزدیک جی لگانے کے بالکل قابل نہیں، جنہیں غیر اللہ کے فانی ہونے اور اللہ تعالیٰ کے لافانی اور باقی ہونے کا یقین حاصل ہے وہ کیسے باقی کے مقابلے میں فانی پر اپنا دل قربان کرسکتے ہیں؟ اور کیوں کر اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں دِل کو متاعِ دنیا میں مشغول رکھ سکتے ہیں؟ اس لئے یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ مومن ہر وقت دل کو دنیا کے حساب وکتاب اور نفع ونقصان کی چکر میں لگائے نہ رکھے بلکہ تمام نعمتوں کے خالق اور تمام مرتبوں کے مالک حق جل شانہ کی یاد اور اس کے ذکر مذاکرے میں دلچسپی لے اور اسی کی طرف دھیان بنائے رکھے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی فکریں ذہن کو مشوّش اور دل کو بے چین کئے رکھتی ہیں اور یادِ الٰہی ان تشویشوں اور بے چینیوں کو دور کر کے مسرور ومطمئن رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ (سورۃ الرعد:۲۸)

یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، اور جن کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ سنو! یادِ الٰہی ہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

۲۴

جہاں تک ہو سکے دوسروں کو فائدہ پہونچایئے، خواہ دنیا کا ہو یا دین کا۔

قرآن مجید میں انسانیت کی نفع رسانی اور ان کے ساتھ ہمدردی کی طرف بہت توجہ دلائی گئی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴿۸﴾ (سورۃ الدھر:۸)

اور وہ (نیک بندے) اللہ تعالیٰ کی محبت کی خاطر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

نیکیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآىِٕلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ (سورۃ البقرہ:۱۷۷)

اور (نیکی یہ ہے کہ) اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، اور سائلوں کو دیں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں۔

دینی نفع پہونچانے کی بھی بہت تاکید ہے مثلاً فرمایا:

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۝۱۰۴ (سورۃ آل عمران: ۱۰۴)

اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جس کے افراد بھلائی کی طرف بُلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور بُرائی سے روکیں، ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ (رواہ مسلم: ۲۶۹۹)

اللہ اپنے بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک کہ بندہ اس کے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”جو شخص کسی پریشان حال کی فریادرسی اور کاربرآری کرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے تہتر بخششیں لکھ دیتے ہیں، جن میں سے ایک تو اس کے تمام دنیوی کاموں کے لئے کافی ہوجائے گی اور بہتّر آخرت میں کام آئیں گی۔ (شعب الایمان: ۶/۱۲۰)

ایک حدیث میں ہے کہ ”جس شخص نے کسی مسلمان کی کوئی تکلیف دور کردی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے ایک تکلیف دور کردے گا۔“ (بخاری: ۵/۹۷)

ایک حدیث میں ہے کہ ”کسی بیوہ یا یتیم کے لئے کمانے والا راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے۔“ (بخاری: ۱۰/۴۳۷)

وغیرہ بے شمار آیات واحادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خیر خواہ ہونا چاہیئے، اپنی بساط کے مطابق دینی اور دنیوی مدد کرتے رہنا چاہیئے، کیوں کہ ایک دوسرے کی خیر خواہی اور نفع رسانی اللہ ورسول کی پسندیدہ صفات میں سے ہے، حتیٰ کہ اس معاملے میں تو مسلمانوں کی تخصیص بھی نہیں ہے، بلالحاظِ مذہب وملت ہر دُکھی کا دُکھ دور کرنا چاہیئے، اور دین ودنیا کا نفع پہونچاتے رہنا چاہیئے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن بندے کو بلا کر پوچھے گا میں بیمار ہوگیا

تھا تو نے میری مزاج پُرسی کیوں نہیں کی؟ بندہ کہے گا آپ تو بیماری سے پاک ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا مگر تو نے اس کی عیادت نہیں کی اگر کرنے جاتا تو مجھے یعنی میری رضا کو وہاں پالیتا، پھر پیاسا ہونے اور پانی نہ پلانے، ننگا ہونے اور کپڑا نہ پہنانے کی بابت سوالات فرما کر یہی کہتا رہے گا کہ اگر تو اس کی حاجت برآری کو پہونچتا اور مدد کرتا تو مجھے وہاں پالیتا، یعنی میری رضا و خوشنودی کو پالیتا۔ (مسلم:2569)

اس حدیث میں انسانیت نوازی اور نفع رسانی کی فضیلت اور اہمیت خوب واضح ہے۔

۲۵

کھانے پینے میں نہ اتنی کمی کرے کہ کمزور یا بیمار ہو جائے نہ اتنی زیادتی کرے کہ عبادت میں سُستی ہونے لگے۔

ہر کام میں قصد و اعتدال یعنی میانہ روی اسلام میں بہت پسندیدہ صفت ہے، عقل بھی یہی کہتی ہے کہ درمیانی چال پسندیدہ چال ہے، بالخصوص کھانے پینے میں اعتدال تو اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ کیوں کہ اس سے آدمی کی صحت کا تعلق ہے، اور تمام دینی و دنیوی کاموں کی بہتر تکمیل صحت کی سلامتی پر موقوف ہے، اس لئے خود قرآن کریم نے بڑے اہتمام سے اس پر متنبہ کیا ہے:

وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾	اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی مت کرو، یادرکھو کہ اللہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔
(سورۃ الاعراف:۳۱)	

اطباء بھی یہی کہتے ہیں جب تک بھوک اچھی طرح نہ لگ جائے کھانا نہیں چاہیئے اور تھوڑی بھوک باقی رکھ کر ہی کھانے سے رُک جانا چاہیئے، اس سے غذا کے جزوِ بدن بننے میں

مدد ملتی ہے اور طبیعت کے چُست اور بانشاط رہنے میں سہولت رہتی ہے، ورنہ جب آدمی نفسانی تقاضوں کے مطابق موقع بے موقع اور ہَوس بھر کھانے کا عادی ہوگا تو ہمیشہ اس کی طبیعت میں انقباض اور کاہلی غالب رہے گی، لازماً اس کے تمام کاموں پر اثر پڑے گا، نہ ہی دین کے تقاضے صحیح طریقہ پر پورے کر سکے گا اور نہ ہی دنیا کے معاملات ڈھنگ سے ادا کر سکے گا، اس لئے کھانے پینے میں ایک مسلمان کو اعتدال کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: ''کھانے پینے میں زیادتی کرنے سے بچو، کیوں کہ یہ جسم کو خراب کرنے، امراض کو پیدا کرنے، اور سستی و کاہلی لانے والا عمل ہے، اعتدال کے ساتھ کھانا پینا نظامِ صحت کو درست رکھتا ہے، اور اسرف جیسے مذموم عمل سے بچاتا ہے۔

(روح المعانی: ۸/۴۸۸)

البتہ بعض لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ کم کھانا سلوک و تصوُّف کے لوازم میں سے ہے اور اس خیال سے قدرِ حاجت سے بھی بہت کم تناول کرتے اور ترکِ لذات و مُقوِّیات کا اہتمام کرتے ہیں یہ بھی بالکل غلط خیال ہے، اسلام میں طریق و سلوک اعمالِ صالحہ کے اہتمام اور معاصی و منکرات سے اجتناب کے ذریعہ راہِ خدا میں ترقی کرتے رہنے کا نام ہے، نہ کہ حلال و جائز نعمتوں سے اجتناب کرنے کا، یہ تو غیر مسلم جوگیوں کے خیالات ہیں کہ وہ ترکِ لذّات و شہوات کو ریاضت و مجاہدہ سمجھتے اور خواہ مخواہ تکالیف برداشت کرتے ہیں، اسلام جو کہ دینِ فطرت ہے وہ اس کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ منع کرتا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ

(سورۃ الاعراف: ۳۲)

کہو کہ: ''آخر کون ہے؟ جس نے زینت کے اُس سامان کو حرام قرار دیا ہو جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے، اور (اسی طرح) پاکیزہ روزیوں کو؟''

اور اہلِ کتاب کا رد کرتے ہوئے فرمایا:

وَرَهۡبَانِيَّةً ابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا

(سورۃ الحدید: ۲۷)

اور جہاں تک رہبانیت کا تعلق ہے وہ انہوں نے خود ایجاد کرلی تھی، ہم نے اُس کو ان کے ذمے واجب نہیں کیا تھا لیکن انہوں نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنی چاہی، پھر اُس کی ویسی رعایت نہ کرسکے جیسے اُس کا حق تھا۔

حالاں کہ ان لوگوں نے یہ ترکِ لذات وشہوات صرف رضائے الٰہی کی غرض سے کیا تھا مگر نہ وہ عند اللہ معتبر ہوسکا نہ ہی وہ لوگ اس پر قائم رہ سکے، اس لئے کھانے پینے میں اتنی کمی بھی مناسب نہیں ہے کہ حقوقِ نفس پامال ہوں اور ضعف وکمزوری پیدا ہوجائے ایسی زیادتی بھی مذموم ہے جو نشاطِ طبعی کو ختم کرکے سُستی وکاہلی پیدا کردے، بلکہ اعتدال ومیانہ روی کا معمول رکھنا چاہیئے۔

۲۶

اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے طمع نہ رکھے، نہ کسی طرف خیال دوڑائے کہ فلاں جگہ سے یہ کام ہوجائے گا۔

بھروسہ کرنے کے قابل صرف اللہ کی ذات ہے، کیوں کہ وہی ایک ذات قادرِ مطلق ہے، بے نیاز ہے، اور مالک ومختار ہے باقی سب عاجز وبے بس ہیں، سراپا فقر واحتیاج ہیں، ایک محتاج دوسرے محتاج سے کیا توقع رکھ سکتا ہے؟ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ (سورۃ البقرہ:۱۴۸)

بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر ارشادِ باری ہے:

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲﴾ (سورۃ الفاطر:۲)

جس رحمت کو اللہ لوگوں کے لئے کھول دے، کوئی نہیں ہے جو اُسے روک سکے، اور جسے وہ روک لے، تو کوئی نہیں ہے جو اس کے بعد اُسے پہونچا سکے۔ اور وہی ہے جو اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ہے:

إِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ أَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾ (سورۃ الطلاق:۳)

یقین رکھو کہ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے (البتہ) اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

یہ اور ان جیسی بے شمار آیات بتلاتی ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ مالک و مختار ہے جو چاہے سُو کر سکتا ہے، بندے خود اپنے مالک نہیں ہیں تو دوسروں کے کیا مالک ہو سکتے ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے:

يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ إِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ (سورۃ الفاطر:۱۵)

اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا بذاتِ خود مستحق ہے۔

ایک اور جگہ ارشادِ باری ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ

کان لگا کر سنو! تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن جن کو دُعا کے لئے پکارتے ہو وہ ایک مکھی

وَإِنۡ يَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَيۡـًٔا لَّا يَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ ﴿٧٣﴾

(سورۃ الحج: ٧٣)

بھی پیدا نہیں کر سکتے، چاہے اس کام کے لئے سب کے سب اِکٹھے ہو جائیں، اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اُس سے چھڑا بھی نہیں سکتے، ایسا دُعا مانگنے والا بھی بودا اور جس سے دُعا مانگی جارہی ہے وہ بھی!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی بہت صراحت سے اس حقیقت کو جا بہ جا بیان فرمایا ہے، ارشاد ہوا:

واعلم أن الأُمة لو اجتمعت على أَن ينفعوك بشيء ، لم ينفعوك إلا بشيء قد كتبه اللّٰہ لك ، وإن اجتمعوا على أن يضروك بشيء ، لم يضروك إلا بشيء قد كتبه الله عليك

(ترمذی: ۴/۵۷۵)

یقین رکھو کہ پوری امت اگر تمہیں کسی چیز سے نفع پہونچانے کے لئے اکھٹی ہوگئی تو بھی تقدیرِ الٰہی سے زیادہ نفع نہیں پہونچا سکتی اور سب کے سب تمہیں کچھ ضرر پہونچانے پر متفق ہو جائیں تب بھی تقدیر سے زیادہ ضرر نہیں پہونچا سکتے۔

جب بات یہ ہے کہ سوائے حق تعالیٰ کے کوئی ذات ایسی نہیں جو کسی کو نفع یا نقصان پہونچا سکے تو پھر آدمی کیسے کسی غیر اللہ سے کوئی توقع یا خوف رکھ سکتا ہے؟ اس لئے مومن کو چاہیئے کہ وہ حق تعالیٰ شانہ کی قدرتِ مطلقہ، حکمتِ بالغہ اور خود مختاری و بے نیازی کے مضمون پر برابر نظر رکھے رہے، اس کے ساتھ ساتھ مخلوق کی بے بسی و محتاجی کے احوال پر بھی غور کرتا رہے تاکہ مخلوق سے توقعات اور امیدیں گھٹتی رہیں، اللہ تعالیٰ پر توکّل اور بھروسے میں اضافہ ہوتا رہے۔

ارشادِ نبوی ہے:

اذا سألت فاسئل الله واذا استعنت فاستعن باللّٰہ (ایضاً)

جب تم کچھ مانگو تو اللہ سے مانگو، اور جب مدد چاہو تو اللہ سے مدد چاہو۔

یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سلسلے میں بہت کافی وشافی ہدایت ہے جسے ملحوظ رکھ کر جینے والا نہ کبھی پریشان ہوگا اور نہ ہی ذلیل ورسوا! البتہ تدابیر واسباب کا اختیار کرنا اس توکّل کے منافی نہیں ہے، ممنوع ومذموم بھی نہیں بلکہ اُن کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، اس نمبر کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آدمی ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھ جائے اور یوں سمجھے کہ غیر اللہ سے کوئی توقع نہ رکھنا چاہیئے، اصل مقصود یہ ہے کہ اپنے کاموں کے لئے جو تدبیر ضروری اور مناسب ہے وہ تو کرنا چاہیئے اور حکمت ودانش مندی سے کرنا چاہیئے، اور تدبیر کو حکمِ خداوندی سے مؤثر بھی سمجھنا چاہیئے مگر حقیقی ومؤثر حق تعالیٰ کے اس حکم اور تقدیر کو سمجھنا چاہیئے جو اس نے تدابیر سے وابستہ کر رکھی ہے، جب یہ اعتقاد ہوگا تو تدبیر کر کے بھی تدبیر پر بھروسہ نہیں رکھے گا، دھیان بس مؤثرِ حقیقی یعنی حق تعالیٰ کی ذاتِ عالی پر ہی رہے گا، اسی سے لَو لگائے گا اور اسی پر نظر جمائے رہے گا، پھر اگر تدبیر بے اثر ثابت ہوئی تو زیادہ سے زیادہ طبعی غم ہوگا اس سے زیادہ نہیں، اس لئے کہ توقعات مخلوق سے وابستہ نہ تھے اللہ تعالیٰ سے تھے۔

۲۷

اللہ تعالیٰ کی تلاش میں بے چین رہے۔

رضائے الٰہی مقصودِ حیات ہے، یعنی ہر کام اِس لئے کیا جائے کہ بس اللہ تعالیٰ کو اچھا لگے اور وہ راضی اور خوش ہوجائے، اس کے علاوہ کوئی اور مقصود نہ ہو، اسی کو اللہ تعالیٰ کی تلاش میں بے چین رہنا کہتے ہیں، قرآن وحدیث میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ
(سورۃ البینۃ:۵)

اور اُنہیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ بندگی کو بالکل یکسو ہو کر صرف اُسی کے لئے خالص رکھیں۔

اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ؕ
(سورۃ فصلت:٦)

تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، لہذا تم اپنا رُخ سیدھا اسی کی طرف رکھو، اور اُسی سے مغفرت مانگو۔

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا
(سورۃ الحج:٣٤)

لہذا تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، چنانچہ تم اسی کی فرماں برداری کرو۔

وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿٥٤﴾
(سورۃ الزمر:٥٤)

اور تم اپنے پروردگار سے لو لگاؤ، اور اس کے فرماں بردار بن جاؤ قبل اس کے کہ تمہارے پاس عذاب آپہونچے، پھر تمہاری مدد نہ کی جائے۔

صحابہ کرامؓ کے اخلاص کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (سورۃ الروم:٣٨)

جو لوگ اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں، اُن کے لئے یہ بہتر ہے، اور وہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى
(سورۃ اللیل:٢٠)

البتہ وہ صرف اپنے اُس پروردگار کی خوشنودی چاہتا ہے جس کی شان سب سے اونچی ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (سورۃ الدھر: ۸،۹)

وہ اللہ کی محبت کی خاطر مسکینوں، یتیموں، اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تو تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کھلا رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ مومن کی زندگی کا مقصد حق تعالیٰ کی رضاء وخوش نودی کا حصول ہے، اسی کو صوفیاء لا مقصود الا اللہ کہتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے لے کر اولیاء تک صحابہ کرامؓ محدثین عظام، فقہاء، داعی وغازی سب کے سب اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل سے رضائے الٰہی کو طلب کرتے تھے، ہمیشہ اس کا استحضار تھا اور اس فکر وغم میں رہتے تھے کہ اس عمل سے اللہ پاک راضی ہوا یا نہیں؟۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ریاء کار یعنی غیر اللہ کے لئے کام کرنے والے سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے، جہاد میں بھی اللہ مقصود ہو، حج میں بھی، نماز، روزے میں بھی، حتیٰ کہ کھانے پینے اور بیوی سے ملنے میں بھی رضائے الٰہی کو مقصود بنانے کی تعلیم دی گئی ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے تمام اعمال کو خالصۃً لوجہ اللہ کرے، اور اس کی رضا وخوشی کے حصول کے لئے بے تاب وبے چین رہے، اللہ تعالیٰ کو ڈھونڈ ھنے اور پانے کا یہی طریقہ ہے۔

۲۸

نعمت تھوڑی ہو یا بہت اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے اور فقر وفاقہ سے تنگ دل نہ ہو۔

یہ بات طئے ہے کہ روزی رساں اصلاً حق تعالیٰ شانہ کی ذاتِ عالی ہی ہے، اس نے بندوں کی روزی روٹی بلکہ تمام ضروریاتِ زندگی اپنے ذمّے لے رکھی ہے اور وہی اس کے فیصلے فرماتا ہے، البتہ اس کا ہر کام عظیم مصلحتوں اور ہزاروں حکمتوں کے تحت ہوتا ہے، اسی حکمت کے تقاضے سے اس نے اپنے بندوں کی روزی روٹی اور ضروریات کا انتظام ایک جیسا کرنے کے بجائے کمی بیشی کے ساتھ کیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۞ (سورۃ ھود:٦)

اور زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ نے اپنے ذمے نہ لے رکھا ہو، وہ اس کے مستقل ٹھکانے کو بھی جانتا ہے، اور عارضی ٹھکانے کو بھی، ہر بات ایک واضح کتاب میں درج ہے۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۞ (سورۃ الذاریات:٢٢)

تمہاری روزی اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا گیا ہے سب آسمانوں میں ہے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (سورۃ الرعد:٢٦)

اللہ جس کو چاہتا ہے رزق میں وسعت کر دیتا ہے، اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی کر دیتا ہے۔

اس قلت کی مصلحت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزْقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰکِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ؕ اِنَّہٗ بِعِبَادِہٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۲۷﴾

(سورۃ الشوریٰ: ۲۷)

اور اگر اللہ اپنے تمام بندوں کے لئے رزق کو پھیلا دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کرنے لگتے، مگر وہ ایک خاص انداز ے سے جتنا چاہتا ہے (رزق) اُتارتا ہے۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے پوری طرح باخبر، اُن پر نظر رکھنے والا ہے۔

مذکورہ آیات سے تین باتیں صراحۃً معلوم ہوتی ہیں، ۱ روزی رساں صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور اس نے یہ کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے، ۲ روزی یعنی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں اس نے حکمۃً یکسانیت نہیں رکھی بلکہ کمی زیادتی کو ملحوظ رکھا ہے۔ ۳ بہت سی حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سارے ہی لوگ مرفّہ الحال اور مال دار ہو جاتے تو لوگ روئے زمین پر فتنہ وفساد برپا کر دیتے اور نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا، جب یہ بات ہے کہ روزی اور دیگر نعمتیں آسمانی فیصلوں اور قضاء وقدر کے ماتحت ہیں تو آدمی مناسب سعی اور تدبیر کر لینے کے بعد نعمتیں جتنی بھی ملیں کم یا زیادہ ہر حال میں راضی بہ رضا بلکہ شاکر وقانع رہے، کیوں کہ اسی میں ذہنی سکون اور قلبی راحت ہے اور اسی میں حق تعالیٰ شانہ کی رضا وخوش نودی پوشیدہ ہے۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے اور شکوے سے مالکِ حقیقی کی ناشکری و بے قدری ہوتی ہے، کیوں کہ بندوں کا حق تعالیٰ پر کوئی حق نہیں ہے، وہ عطا کرے تو فضل ہے محروم کرے تو عدل ہے، ظلم کسی صورت میں وہ اپنے بندوں پر نہیں کرتا، قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ﴿۷﴾

(سورۃ ابراھیم: ۷)

اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا، اور اگر تم نے ناشکری کی تو یقین جانو، میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا ؕ وَقَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِىَ الشَّكُوۡرُ ﴿۱۳﴾ (سورۃ سبا: ۱۳)

اے داؤد کے خاندان والو! تم ایسے عمل کیا کرو جن سے شکر ظاہر ہو، اور میرے بندوں میں کم لوگ ہیں جو شکر گذار ہیں۔

دوسری بات حضرتؒ نے اس نمبر میں یہ ارشاد فرمائی کہ ''فقر و فاقہ سے تنگ دل نہ ہو، یعنی اولاً تو فقر و فاقہ کی نوبت کم ہی آتی ہے پھر بھی اگر قضائے الٰہی سے غُربت و ناداری اس حد تک پہونچ جائے کہ آدمی کو فاقہ کرنا پڑے، بھوکا رہنا پڑے، تو بھی صبر و ثبات اور ہمت وحوصلہ سے کام لیتے ہوئے حالات کے بدلنے اور فراخی و کشائش پیدا ہونے کا منتظر رہے، شکوہ و شکایت اور جزع و فزع سے بچتا رہے، اس لئے کہ ہوگا تو وہی جو مقدر ہے مگر بندے کی پہلی حالت یعنی صبر ثبات دیر یا سویر یعنی دنیا ہی میں یا آخرت میں بہتر بدلے کا سبب بنے گی اور دوسری حالت یعنی شکوہ و شکایت میں دنیا تو گئی ہی آخرت بھی برباد ہو جائے گی، گویا نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم کا مصداق ہو جائے گا۔

۲۹

اپنے ماتحتوں اور چھوٹوں کی غلطیوں کو معاف کر دیا کرے۔

غلطی سے کون محفوظ ہے؟ ہر انسان خطا و نسیان کا پُتلا ہے، اس لئے اکثر اپنے ماتحت مثلاً بیوی، بچے، شاگرد، نوکر چاکر، اور ماتحت کام کرنے والے لوگوں سے جو غلطیاں ہوتی رہتی ہیں اُن پر نرمی اور شفقت کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ رکھنا چاہیئے، اصلاح و درستی کے لئے بہ قدرِ ضرورت تنبیہ علاحدہ چیز ہے لیکن اسی کے ساتھ انہیں معاف بھی کر دینا چاہیئے، بالخصوص جب کہ کوئی نادم ہو کر معافی کا خواستگار ہو۔

بعض لوگوں کی طبیعتیں بہت سخت ہوتی ہیں اور وہ درگذر کرنا جانتے ہی نہیں، انتقامی رویّہ اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے لئے کسی موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں، انہیں سوچنا چاہیئے کہ ہم خود اللہ تعالیٰ کے کس قدر قصوروار ہیں اور ان بے حد وحساب قصوروں کے باوجود اُس سے معافی ہی کے خواستگار اور اُمیدوار ہیں، تو ہم اپنے لئے اپنے بڑے سے جو چاہتے ہیں اپنے چھوٹوں کے لئے بھی تو ہم کو یہی معاملہ پسند کرنا چاہیئے۔

قرآن وحدیث میں معاف کردینے کی بڑی فضیلت آئی ہے، حق تعالیٰ شانہ کا ارشادِ گرامی ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾ (سورۃ الاعراف:۱۹۹)

(اے پیغمبر!) درگذر کا رویّہ اپناؤ، اور (لوگوں کو) نیکی کا حکم دو، اور جاہلوں کی طرف دھیان نہ دو۔

حضرت ابوبکرؓ اپنے ایک زیر کفالت رشتہ دار کی ایک سنگین غلطی پر اس کی کفالت سے دست بردار ہوجانا چاہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا:

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢﴾ (سورۃ النور:۲۲)

اور اُنہیں چاہیئے کہ معافی اور درگذر سے کام لیں، کیا تمہیں پسند نہیں ہے کہ اللہ تمہاری خطائیں بخش دے؟ اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

اپنے نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٣٤﴾ (سورۂ اٰل عمران:۱۳۴)

اور جو غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کردینے کے عادی ہیں، اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔

یہ آیتیں بتارہی ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ اپنے بندوں میں یہ صفت دیکھنا چاہتے ہیں اور پسند کرتے ہیں کہ وہ خطا کاروں سے درگذر کردیا کریں اور عفو ومعافی کو اپنا شیوہ بنائیں، اس

لئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس کی تعلیم فرمارہے ہیں اور عامۂ مؤمنین کو بھی ترغیب دے رہے ہیں۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی یہ صفت اختیار کی اور پوری اُمّت کو تعلیم بھی یہی دی، فرمایا:

ما زاد اللہ عبدا بعفو الا عزاً (مسلم:۲۵۸۸)	اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کی عزت بڑھا دیتا ہے۔

نیز فرمایا:

صل من قطعک واعط من حرمک واعف عمّن ظلمک واحسن الی من اساء الیک (مسند احمد:۱۷۴۵۲)	کوئی تم سے رشتہ توڑے تو تم اس سے رشتہ جوڑو، جو تم کو نہ دے تم اس کو دو، جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کردو، جو تم سے بُرا سلوک کرے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

۳۰

کسی کا عیب معلوم ہو جائے تو اس کو چھپائے، کسی اور کے سامنے ظاہر نہ کرے، البتہ اگر کوئی کسی کو نقصان پہونچانا چاہتا ہے اور تم کو معلوم ہو جائے تو اُسے بتا دو۔

لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرنا یعنی چھپانا کسی بھی سماج کی نیک نامی کے لئے ضروری ہے، اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اس صفت کی طرف بہ طورِ خاص متوجہ کیا ہے، اور اس پر کاربند رہنے کی تاکید بھی فرمائی ہے، سورۂ حجرات کی یہ آیت اس باب میں بہت جامع ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا۟ بِٱلْأَلْقَٰبِ ۖ بِئْسَ ٱلِٱسْمُ ٱلْفُسُوقُ بَعْدَ ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿١١﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱجْتَنِبُوا۟ كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا۟ وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾

(سورۃ الحجرات:۱۱، ۱۲)

اے ایمان والو! نہ تو مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اُڑا رہے ہیں) خود اُن سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اُڑا رہی ہیں) خود اُن سے بہتر ہوں اور تم ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو اور نہ ایک دُوسرے کو بُرے القاب سے پکارو، ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام نا بہت بُری بات ہے، اور جو لوگ ان باتوں سے باز نہ آئیں تو وہ ظالم لوگ ہیں، اے ایمان والو! بہت گمانوں سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگو، اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو، کیا تم میں سے کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو خود تم نفرت کرتے ہو! اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، بہت مہربان ہے۔

یہ آیت اس قسم کی تمام بداخلاقیوں کی مذمت بیان کررہی ہے، مسخرہ پن بھی عیوب کے اظہار وافشاء کے لئے ہی ہوتا ہے، چوں کہ اس میں عورتیں زیادہ مبتلا رہتی ہیں تو انہیں بہ طورِ خاص حکم دیا گیا، طعنہ دینا بھی عیوب کے اظہار ہی سے متعلق ہے، بُرے لقبوں اور ناموں

سے پکارنا بھی عیب جوئی ہی کی ایک قسم ہے، بدگمانی بھی اگر دیکھا جائے تو عیوب جاننے ہی کو کہتے ہیں، اخیر میں غیبت بھی یعنی پیٹھ پیچھے بُرائی کرنے سے روکا گیا ہے، غور کیا جائے تو آیتِ مذکورہ میں مذکور تمام ممانعتیں دوسروں کے عیوب کے درپئے ہونے ہی سے تعلق رکھتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں لوگوں کی پردہ دری کو برداشت نہیں کیا جاتا پردہ داری کا حکم دیا جاتا ہے۔

قرآن کریم کے علاوہ احادیثِ شریفہ میں بھی اس بُری عادت کی مذمت آئی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

من ستر مسلما ستره الله یوم القیمة (بخاری: ۵/۹۷)

جو شخص کسی مسلمان کے عیوب چھپائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیبوں کو چھپائے گا۔

ایک حدیث میں ہے "مسلمانوں کو تکلیف مت پہونچاؤ، ان کو عار مت دلاؤ، ان کے عیبوں کی ٹوہ میں مت رہو، اس لئے کہ جو مسلمانوں کے عیوب کی ٹوہ میں رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کی گرفت کرتے ہیں اور جن کے عیوب کی گرفت اللہ تعالیٰ فرمانے لگیں تو اس کو ذلیل ہی کر کے رکھ دیتے ہیں"۔ (ابوداؤد: ۵/ ۱۹۴)

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ آپس میں ایک دوسرے کے عیوب جاننے کے پیچھے نہ پڑیں اور اگر کسی کا عیب معلوم ہو جائے تو جہاں تک ممکن ہو اُسے اپنی حد تک رکھیں، کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں دوسرے کی بے آبروئی اور بے عزتی کو اپنی ہی رسوائی و ذلت سمجھیں، اس کا فائدہ دنیا میں تو یہ ہوگا کہ مسلم سماج معزّز و باوقار رہے گا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ہمارے عیوب کی پردہ داری کرتے ہوئے ہمیں سرِ محشر رُسوا ہونے سے بچالے گا، اور اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو دنیا میں خود اپنی ذلت و رسوائی ہوگی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی ستّاری سے محروم ہو جائیں گے۔

اس ہدایت میں دو باتیں اور سمجھ لینے کی ہیں، ایک تو یہ کہ کسی کی ستر پوشی اور پردہ داری کا

مطلب دوسروں کے سامنے اظہار کرنے سے بچنا ہے، جہاں تک نکیر واصلاح کا تعلق ہے تو یہ ذمہ داری اپنی جگہ بالکل برحق ہے کہ حکمت اور تحفظِ ناموس کے ساتھ مسلمانوں کو ان کے عیوب پر متوجہ کرتے رہیں اور اصلاح کی تاکید کرتے رہیں۔

دوسرے یہ کہ اگر کسی شخص میں ایسا عیب ہے جس سے کسی شخص کا یا عوام کا ضرر ہو سکتا ہے تو ایسی صورت میں اس کے ایسے عیب کو اس شخص یا عوام پر ظاہر کر دینا چاہیئے، مثلاً کسی شخص میں چوری کی عادت ہو یا قرض لے کر واپس نہ کرتا ہو یا ظالم و بداخلاق ہو۔ وغیرہ



مہمانوں، مسافروں، غریبوں، اور عالموں کی خوب خدمت کرے۔

ان سب لوگوں کی خدمت بہت بڑی نیکی ہے، اور اچھے لوگوں کی عادت ہے، قرآن کریم میں یہودیوں کو تنبیہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بہت سے نیک کاموں کا ذکر کیا ہے، اسی ضمن میں فرماتے ہیں:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۷)	اور اللہ کی محبت میں یا مال کی محبت کے باوجود اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، اور سائلوں کو دیں، اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں۔

اس آیت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں مانگنے والوں اور قیدیوں یا غلاموں کو آزاد کرانے میں اپنا مال خرچ کرنے کو ایمان ے کی طرح حقیقی نیکی شمار فرمایا ہے۔

مہمان نوازی تو خصوصیاتِ اسلام میں سے ہے، اس صفت کی مستقل فضلیت آئی ہے،

بلکہ حکم دیا گیا ہے، ارشادِ نبوی ہے:

من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلیکرم ضیفہ (بخاری: ۴۴۵/۱۰)	جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

مسافروں کے بارے میں فرمایا:

۔۔۔۔او بیتا لابن السبیل بناہ (ابن ماجہ: ۲۴۲)	یا مسافر کے لئے سرا یا بنایا ہو۔

صدقۂ جاریہ کے ذرائع میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بھی بیان فرمایا کہ مسافر خانہ کی تعمیر کرنا جس سے مسافروں کی خدمت کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

مسکینوں کے ساتھ اس قدر ہمدردی اور یگانگت کا معاملہ فرمایا کہ خود اپنی دعاؤں میں اُن کی معیت اور قیامت کے دن اُن کے ساتھ محشور ہونے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ اور حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرمائی:

یاعائشۃ! لا ترد المسکین ولو بشق تمرۃ یا عائشۃ! احبی المساکین وقربیھم فان اللہ یقربک یوم القیمۃ (ترمذی: ۴۹۹/۴)	اے عائشہؓ! مسکین کو کچھ نہ کچھ دے دیا کرو، چاہے کھجور کی پھانک ہی کیوں نہ ہو، عائشہ! مساکین سے محبت کرو اور انہیں اپناؤ، اللہ تعالیٰ قیامت میں تم کو بھی اپنا مقرب بنائے گا۔

یتیموں اور بیواؤں کے لئے بھی بہت توجہ دلائی، فرمایا:

الساعی علی الارملۃ والیتیم کالمجاھد فی سبیل اللہ (مسند احمد: ۸۷۴۰/۳)	کسی بیوہ اور یتیم کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا بندہ اللہ کے نزدیک راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کے مثل ہے۔

علماء و صلحاء کی خدمت تو دراصل علم کی حفاظت و اشاعت میں مدد ہے، اور اس کی بے شمار

فضیلتیں آئی ہیں، ارشاد نبوی ہے:

ولا یأکل طعامک الا تقی (ابوداؤد:۴۸۳۲) اور اپنا کھانا نیک لوگوں کو کھلاؤ۔

واضح رہے کہ خدمت سے یہاں ہاتھ پیر دبانا مراد نہیں ہے، ضرورت ہو تو یہ خدمت بھی کرسکتا ہے لیکن اصل مقصود اس ہدایت سے ان کی ضروریات کا تکفُّل کرنا اور مخلصانہ ومخفیانہ طور پر مالی امداد کرنا ہے۔

۳۲

ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے۔

یعنی اس کی ناراضگی سے ڈرتا رہے، کیوں کہ وہ محبوب ومقصود ہے اگر وہی خوش نہیں تو کائنات ہماری دشمن ہے، محبوب آنکھیں پھیر لیتا ہے تو پھر کسی نعمت میں کوئی مزہ باقی نہیں رہتا، اس لئے جہاں ہر قسم کی توقع اور امید اللہ تعالیٰ ہی سے رکھنا چاہیئے اور اس کی مغفرت ومہربانی کا مکمل بھروسہ رکھنا چاہیئے وہیں اس محبوبِ حقیقی اور منعمِ ازلی کی خفگی، ناراضگی اور شانِ بے نیازی سے بھی خوب ڈرتے رہنا چاہیئے کہ ہمارے کسی عمل سے وہ خفا نہ ہوجائے، کیوں کہ ہم عاجز وکمزور بندے اتنے بڑے اور قادر وقہّار پروردگار کے غضب یا پکڑ کا سامنا کیسے کرسکتے ہیں ؟اگر وہ خفا ہوجائے تو ہم دونوں جہاں میں تباہ وبرباد ہوجائیں گے۔

انبیاء کرام علیہم السلام اتنے بڑے مرتبے پر ہونے اور حق تعالیٰ کے پسندیدہ بندے ہونے کے باوجود حق تعالیٰ کے ناراض ہوجانے سے اور اس کی شانِ بے نیازی سے ہر وقت ڈرتے رہتے تھے؛ حدیث میں ہے کہ خود ہمارے نبی امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت کثرت سے

یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک اے دلوں کے پلٹنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔

پڑھتے رہتے تھے تو حضرت انس ؓ نے ایک دن پوچھا یا رسول اللہ! ہم آپ پر اور آپ کے دین پر ایمان لائے ہیں، کیا پھر بھی آپ کو ہماری گم راہی کا خطرہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

نعم، ان القلوب بین الاصبعین من اصابع اللہ، یقلبھا کیف یشاء (ابن ماجہ: ۲/ ۱۲۶۰)	ہاں! بندوں کے قلوب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، جدھر چاہے پھیر دیتا ہے۔ (یعنی ہدایت سے گم راہی کی طرف یا گُم راہی سے ہدایت کی طرف!)

یہی حال تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تھا، وہ لوگ قُرب کے بلند ترین مرتبے پر ہونے کے باوجود حق تعالیٰ سے لرزاں وترساں رہتے تھے؛ بلکہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے دن بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبر اپنی بعض معمولی لغزشوں اور بھولوں کو یاد کر کے حق تعالیٰ شانہٗ سے بے انتہا ڈر رہے ہوں گے۔ (بخاری: ۱۱/ ۴۱۷)

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ اگرچہ بے شک رحیم وکریم ہیں اور اپنے بندوں پر بے انتہا مہربانی فرماتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ وہ بہت بے نیاز اور بڑی قدرت والے بھی ہیں خفا بھی ہوتے ہیں پکڑ بھی کرسکتے ہیں، اُس کے رحمٰن ومہربان ہونے کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ایسے مہربان کی ناراضگی سے ہم ہمیشہ ڈرتے اور بچتے رہیں، اور اس کے مُنتقم اور پکڑ کرنے والے ہونے کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ ہم اس کے غضب سے ڈرتے رہیں اسی کے ساتھ مایوسی و نا اُمیدی کو بھی اپنے قریب آنے نہ دیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قریب الموت نوجوان کے پاس آئے اور اس سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے عفو و درگذر کی اُمید بھی ہے اور اپنے گناہوں سے ڈر بھی لگ رہا ہے، آپ نے فرمایا: جس شخص میں یہ دونوں باتیں جمع ہوں اللہ تعالیٰ اس کی اُمید پوری کرتے ہیں اور اس کے خوف کو دور کر دیتے ہیں۔ (ترمذی: ۳/ ۳۱۱)

۳۳

موت کو ہر وقت یاد رکھے۔

موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے دنیا میں کسی کو اختلاف نہیں لیکن مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اس کی حقیقت پر سے سوائے اسلام کے کسی مذہب نے پردہ نہیں اُٹھایا، اسلام موت اور موت کے بعد کا جو نقشہ پیش کرتا ہے وہ کوئی نظریہ نہیں بلکہ عین حقیقت ہے، اس لئے ایک مسلمان کو کبھی اس سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق دنیا اور دنیوی زندگی دونوں ناپائے دار ہیں، جو بھی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ مرنے ہی کے لئے پیدا ہوتا ہے اور جو مرتا ہے وہ یقیناً آخرت کے عالم میں اُٹھایا جائے گا، اور زندگی کے کاموں کرتوتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا، ارشادِ ربانی ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

(سورۃ البقرہ:۲۸)

تم اللہ کے ساتھ کفر کا طرزِ عمل کیسے اختیار کرلیتے ہو، حالاں کہ تم بے جان تھے، اُسی نے تمہیں زندگی بخشی، پھر وہی تمہیں موت دے گا، پھر وہی تم کو (دوبارہ) زندہ کرے گا، اور پھر تم اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے۔

معلوم ہوا کہ ہر زندہ انسان کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا ہے اور زندگی کے بھلے بُرے کا بدلہ دیا جانا ہے، جب یہ بات ہے اور ہم اس پر ایمان بھی لائے ہیں تو ہمیں

موت ہمیشہ یادرکھنی چاہیئے، خواہ ہمیں موت بھلی لگتی ہو یا بُری، سامنا تو کرنا ہی پڑے گا، ارشادِ باری ہے:

اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ (سورۃ النساء:۷۸)	تم جہاں بھی ہو گے (ایک نہ ایک دن) موت تمہیں آ پکڑے گی، چاہے تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ رہ رہے ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت کا وجود ہوتا ہے وہ موت کو بھول جانے کی وجہ سے ہوتا ہے، ساری غفلتوں، گناہوں اور جھگڑوں کا حل اپنی موت کو یاد رکھنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اکثروا ذکر ھاذم اللذات الموت (ترمذی:۴/۴۷۹)	لذتوں کو توڑنے والی چیز یعنی موت کو زیادہ یاد کرو۔

خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہمیشہ موت کو یاد رکھتے اور یاد دلاتے رہتے تھے، ایک انصاری صحابیؓ نے آپ سے دریافت کیا سب سے زیادہ سمجھدار اور عقل مند مسلمان کونسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اکثرھم للموت ذکراً وأحسنھم لما بعدہ استعداداولئک الاکیاس (ابن ماجہ:۴۲۵۹)	جو موت کو ہمیشہ یادرکھنے والے اور موت کے بعد کے لئے تیاری کرنے والے لوگ ہیں، وہی ہوشیار لوگ ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ عقل مند وہی آدمی ہے جو اپنی موت کو یادرکھے، اور موت اور موت کے بعد کی زندگی میں کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق تیاری میں مصروف رہے، کسی وقت غافل نہ ہو۔

۳۴

روزانہ کسی وقت بیٹھ کر دن بھر کے کاموں کو سوچا کرے جو نیکی یاد آئے اس پر شکر بجالائے اور گناہ پر توبہ کرے۔

اس کو محاسبہ اور مراقبہ کہتے ہیں، یعنی اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہنا، اس لئے کہ یہ دنیا کی زندگی اصلاً ایک تجارت ہے جو آدمی نفع نقصان کے ہوش کے بغیر کرتا چلا جارہا ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ⑩ (سورۃ الصّف:۱۰)

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتہ دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلادے؟

ایک اور جگہ کفار کے انجامِ زندگی کو بتاتے ہوئے فرمایا:

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ⑯ (سورۃ البقرہ:۱۶)

نہ اُن کی تجارت میں نفع ہوا، اور نہ اُنہیں صحیح راستہ نصیب ہوا۔

معلوم ہوا کہ اس دنیا کی زندگی میں آدمی اپنے ہر عمل سے دراصل ایک تجارت کررہا ہے، کوئی بدعملی کرکے گھاٹے اور خسارہ میں ہے، کوئی نیکی وفرماں برداری کی راہ چل کے نفع اور فائدے میں ہے۔

جب زندگی کا ہر عمل ایک کاروبار اور تجارت ہے تو دنیا کے عقل مند تاجر کی طرح آخرت کے اس تاجر کو بھی چاہیئے کہ کاروبار کے نفع ونقصان پر ہر وقت نظر رکھا رہے تاکہ نقصان کی تلافی

بروقت کر سکے، ارشادِ ربانی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (سورۃ الحشر:۱۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اُس نے کل کے لئے کیا آگے بھیجا ہے۔

دنیا کے تاجرین بھی روز کا روز حساب کتاب دیکھ لیتے ہیں اور اگر کچھ نقصان کا اندازہ ہو جاتا ہے تو پوری فکر اور مستعدی سے جلد از جلد اس خسارے کی تلافی کا سامان کر لیتے ہیں، حضرتؒ فرما رہے ہیں کہ جب ہم اپنی زندگی کے ذریعہ آخرت کی تجارت کر رہے ہیں تو ہمیں بھی اپنے نفع نقصان کا حساب روز کا روز کر لینا چاہیئے۔

امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا:

حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا (ترمذی:۲۴۵۹)

اپنا محاسبہ کر لو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔

اس کا آسان اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ رات کو سونے سے قبل چند منٹ کے لئے اپنے بستر پر بیٹھ جائے اور صبح اُٹھنے سے لے کر اب بستر پر آنے تک کی تمام مصروفیات اور اعمال پر ایک نظر ڈال لے، جب کوئی نیک کام کا کرنا سامنے آئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے، کیوں کہ ہر نیکی اس کی توفیق ہی کی برکت سے وجود میں آتی ہے، اس لئے اس توفیق دینے والے مہربان کا حق ہے کہ شکر بجالایا جائے، نیز اس لئے بھی شکر ضروری ہے کہ شکر سے نعمت میں اضافے کا وعدہ فرمایا گیا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (سورۃ ابراھیم)

اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔

تو شکر کی برکت سے ایک تو پروردگار خوش ہو جائے گا دوسرے اس نعمت یعنی نیک کام کی اور زیادہ توفیق دے گا۔

اسی طرح اس مراقبے اور محاسبے کے دوران کوئی گناہ کا کام یا نامناسب کام یاد آئے تو

ندامت وشرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے حق تعالیٰ سے معافی مانگ لے، اور اگر اس گناہ کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے تو تلافی کا ارادہ اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ بھی کر لے۔ اس کے بھی دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ اگر موت آ گئی تو اللہ تعالیٰ سے معاملہ صاف کر کے مرنے والوں میں شمار ہوگا اور زندگی میں برکت ہوئی تو تلافی کی فکر کرے گا اور آئندہ اس قسم کے گناہوں سے بچنا آسان ہوگا، بہر حال اس مراقبے اور محاسبے کا دین کی ترقی میں بہت دخل ہے۔

۳۵

جھوٹ ہرگز نہ بولے۔

یوں تو ہر گناہ آدمی کے دین اور روحانیت کے حق میں ہلاک کر دینے والا زہر ہے، لیکن جھوٹ کی اس میں خاص اہمیت ہے، نمبر دو پر ہر گناہ سے بچنے کی ہدایت دینے کے باوجود بہ طور خاص جھوٹ کو مستقل نمبر کے تحت بیان فرما رہے ہیں، وجہ یہ ہے کہ کتاب وسنت میں اس گناہ سے بہت ڈرایا گیا ہے، اسے منافقوں کی خصلت قرار دیا گیا ہے ظلم فرمایا گیا ہے، لعنتی عمل بتلایا گیا ہے، ارشاد ہے:

فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۶۱﴾
(سورۂ آل عمران: ۶۱)

اور جو جھوٹے ہیں ان پر ہم اللہ کی لعنت بھیجیں۔

ایک اور جگہ پر فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰهِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳﴾
(سورۃ الصّف: ۲، ۳)

اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی قابلِ نفرت ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی جھوٹ سے بچنے کی بہت تاکید فرمائی ہے، ایک حدیث میں ہے:

ایاکم والکذب فإن الکذب یھدی الی الفجور وان الفجور یھدی الی النار (بخاری: ۱۰/۷ ۵۰)

جھوٹ سے بچو، اس لئے کہ کذب نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور نافرمانی جہنم میں لے جاتی ہے۔

یہ بھی فرمایا گیا ہے جھوٹ اور ایمان جمع نہیں ہوسکتے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ کرامؓ کو بڑے بڑے گناہ بتلائے تو اس میں جھوٹ بولنا بھی شمار فرمایا۔ (مسندِ احمد: ۱۲۳۳۸)

ان سب آیات واحادیث سے کذب بیانی اور جھوٹ بولنے کی مذمت اچھی طرح معلوم ہوگئی، اس کے علاوہ اور بہت طریقوں سے جھوٹ کی مذمت بیان کی گئی ہے، بالخصوص اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف منسوب کرکے جھوٹ بولنا تو اور بھی سخت مذموم حرکت اور بدترین عمل ہے، فرمایا:

من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ (مسند احمد: ۵۸۴)

جو میری طرف جان بوجھ کر جھوٹ منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

اس کے بعد معلوم ہونا چاہیئے کہ جھوٹ کی بہت سی قسمیں ہیں، آج معاشرہ میں جھوٹ عام ہوگیا ہے اور عام ہوجانے کی وجہ سے دینی حلقے بھی بُری طرح متأثر ہوگئے ہیں، حد یہ ہے کہ علماء وصلحاء بھی اس بدترین گناہ سے بچے ہوئے نہیں نظر آتے، بہت ڈرنے کی ضرورت ہے، جب تک کافی توجّہ اور فکر کے ساتھ ارادہ وقصد کرکے نہیں بچیں گے بچنے کی کوئی صورت بظاہر نہیں ہے، تمام مسلمان بالخصوص سالکین اس مرض کی طرف خاص توجہ دیں، حق تعالیٰ توفیق دے۔ آمین

٣٦

جو محفل خلافِ شرع ہو وہاں ہرگز نہ جائے۔

دین وایمان کا تحفظ بہت اہم مسئلہ ہے، دین کی سلامتی کے اسباب میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے آپ کو بُرے ماحولوں اور گناہ کے اسباب سے دور رکھے، کیوں کہ ماحول کا دل پر اثر پڑنا ایک لازمی امر اور بدیہی بات ہے، جب آدمی ایسے مقامات پر جائے گا جہاں منکراتِ شرعیہ کا ارتکاب ہو رہا ہو تو اُن منکرات کے بُرے اثرات سے اپنے دین کو کیوں کر بچا سکتا ہے؟ قرآن مجید میں بھی غلط محفلوں میں شرکت سے منع فرمایا گیا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ

(سورۃ النساء: ١٤٠)

اور اس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک مت بیٹھو جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں، ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔

ان مجلسوں میں قرآن کریم کے احکام کا قولاً مذاق اُڑایا جاتا تھا بہت سی مجلسیں اب خود مسلمانوں میں ایسی منعقد ہوتی ہیں جن میں ایاتِ قرآن اور احکاماتِ الٰہیہ کا عملاً مذاق اُڑایا جاتا ہے، ہر طرح کی خُرافات، بدعات، رسومات وروایات اور فضول خرچیاں دین سے پوری طرح بے نیاز ہو کر کی جاتی ہیں، ایسی جگہوں پر کوئی اچھی بات سُننے ماننے والا بھی نہیں ہوتا،

ایسی صورت میں اِن محفلوں میں شرکت دین وایمان کے لئے کس قدر نقصان دِہ ہے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آج کل شادی بیاہ کی دعوتوں اور گھریلو تقریبات کا بھی یہی حال ہے کہ اسراف وتبذیر، بے پردگی، عورتوں کا تزئین وتجمُّل میں غلو کے ساتھ شرکت، فوٹوکشی وغیرہ بے شمار منکرات ہیں جو عام ہوگئی ہیں، اگر قریبی رشتہ داری ہے اور قطعِ رحمی کا اندیشہ ہے تو ایسی خاص صورتوں میں تو علماء سے مشورہ کر کے عمل کرلیں مگر بالعموم ایسی تقریبات میں شرکت سے مسلمانوں کو احتراز ہی کرنا چاہیئے؛ بالخصوص اہلِ علم وفضل کو تو اس سلسلے میں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں ایک باب اس عنوان سے قائم فرمایا ہے: ''باب هل یرجع اذا رأی منکرا فی الدعوة'' پھر اس کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام منکر سے لوٹ جانے کا واقعہ بیان فرمایا ہے، نیز حضرت ابوایوب انصاریؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے واقعات بھی ذکر کیے ہیں، شُرّاحِ حدیث نے اگرچہ اس کے تحت تفصیلی احکام بیان فرمائے ہیں مگر خلاصہ اُن سب کا بہ حیثیتِ مجموعی یہی ہے کہ مقامِ منکرات میں پہونچ کر اگر نکیر واصلاح کرسکتا ہے تو خیر ورنہ شرکت سے گریز کرنا ہی بہتر ہے؛ پس ہر مسلمان بالخصوص سالکین راہِ حق کو اپنے دین کی ترقی کے لئے اس ہدایت پر بھی نظر رکھنی چاہیئے، خاص صورتوں میں علماءِ حق سے مشورہ کرلیا کریں۔

۳۷

شرم وحیا اور بُردباری سے رہے۔

دراصل حیا ہی وہ صفت ہے جو بہت سی برائیوں سے آدمی کو بچالیتی ہے، مثل مشہور ہے کہ ”بے حیاباش وہرچہ خواہی کُن“یعنی حیاء سے محروم ہوجانے کے بعد آدمی جو بُرائی کرے کم ہے، حدیث پاک میں یہ مضمون وارد ہوا ہے، ارشادِ نبوی ہے کہ پچھلے دینوں کی جو اچھی باتیں رہ گئی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے:

اذافاتک الحیاء فافعل ماشئت — جب حیاء ختم ہوجائے تو جو چاہو کرو۔

(مسند احمد: ۲۳۳۱۴)

اس کے برخلاف شرم وحیا کے بہت فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے:

الحیاء من الایمان (ترمذی: ۳۲۱/۴) حیا ایمان کا حصہ ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے

الحیاء خیر کلّه (بخاری: ۱۵۲۱/۱۰) حیا سراسر خیر ہے۔

ان سب احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاء اور شرم بھلی صفت ہے اور بہت خوبیوں کی حامل ہے، اس کی برکت سے آدمی بہت گناہوں سے محفوظ رہ سکتا ہے، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی تعلیمات میں اس کو بھی شامل فرمایا اور مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی۔

البتہ شرم وحیاء دو طرح کی ہوتی ہے، ایک فطری ہوتی ہے جسے عرف میں شرمانا یا شَرمیلا مزاج کہتے ہیں، یہ ایک فطری کم زوری ہے جو کوئی خوبی نہیں شمار کی جاتی، اس کے مقابلے

میں جرأت وہمت ہے جو پسندیدہ ہے؛ دوسرے وہ حیاء جو ایمانی ہے جو اپنے محسن کی نافرمانی اور بُرے کاموں کے کرنے سے بچاتی ہے اور یہ پسندیدہ ہے، ملا علی قاریؒ نے اس کی تعریف میں لکھا ہے:

الحیاء أن مولاک لایراک حیث نھاک (مرقاۃ المفاتیح:۱/۱۳۵) حیا کی حقیقت یہ ہے کہ تمہارا مولیٰ تمہیں اپنی نافرمانی کے مواقع پر نہ پائے۔

اس تعریف کے بعد آپ کو حیا کی صحیح معرفت حاصل ہوگئی ہوگی اور یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس صفت کی احادیثِ مبارکہ میں اس قدر تعریف وتوصیف کیوں آئی ہے؟ بہرحال! مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس ہدایت پر بھی دل وجان سے عمل کریں، اپنے اندر حقیقی حیاء پیدا کریں تا کہ حق تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچنا اور اُن کے احکام بجالانا بہت آسان ہوجائے۔

دوسری بات اس نمبر میں یہ بتلائی گئی ہے کہ شرم وحیاء کے علاوہ اپنے اندر ''بردباری'' بھی پیدا کرے، بردباری کو عربی میں حِلم کہا جاتا ہے اور اس کا حاصل اپنے اندر وقار وشرافت اور قوتِ برداشت پیدا کرنا ہے، بسا اوقات آدمی خود تو امن وسلامتی سے رہتا ہے، اور دوسروں کے ساتھ اخلاق مندانہ سلوک رکھتا ہے مگر کوئی شخص اُس کے ساتھ بد اخلاقی وزیادتی سے پیش آئے تو ایسے موقع پر تحمُّل اور وقار کا ثبوت نہیں دے پاتا، حالاں کہ یہی وقت ہوتا ہے جب آدمی کو اپنے خُلق وشرافت کے استعمال کی سخت ضرورت پڑتی ہے، اس لئے ہر مسلمان کو حلم و صبر اور تحمل وبردباری کی صفات اپنے اندر پیدا کرنا اور عملی زندگی میں اُس کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔

۳۸

اگر اپنے اندر یہ باتیں پیدا ہو جائیں تو مغرور نہ بنے کہ میرے اندر ایسی خوبیاں ہیں۔

غرور و استکبار ابلیسی صفات ہیں، عجز و انکسار آدمی صفات ہیں، ہم آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، ہمارے اندر آدمی صفات ہونی چاہئیں، ابلیس کی عادات سے ہم کو کیا مطلب؟ تکبُّر اور بڑائی جتلانا صرف اسی ہستی کو زیب دے سکتا ہے جو اپنے کمالات کا مالک ہو اور جس کی صفات و کمالات ذاتی ہوں، اور وہ ذات صرف باری تعالیٰ کی ہے، اسی لئے اس کا ایک نام المتکبر ہے، ہم بندے ہر خوبی و کمال میں حق تعالیٰ کے محتاج ہیں، جو بھی کوئی اچھی بات ہمارے اندر پائی جائے گی تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہوگی، کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات ایسی نہیں جو ہمارا ذاتی کمال ہو یا ہماری تخلیق ہو، اسی لئے قرآن و حدیث میں غرور و استکبار کی بہت مذمت بیان کی گئی ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٤٧﴾ (سورۃ الانفال: ۴۷)

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے، اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے تھے، اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روک رہے تھے، اور اللہ نے لوگوں کے سارے اعمال کو (اپنے علم کے) احاطے میں لیا ہوا ہے۔

اپنے نیک بندے حکیم لقمانؒ کی نصائح کے ضمن میں فرمایا:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿١٨﴾ (سورۃ لقمان:۱۸)

اور لوگوں کے سامنے (غرور سے) اپنے گال نہ پھیلاؤ، اور زمین پر اِتراتے ہوئے مت چلو۔ یقین جانو کہ اللہ کسی اِترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔

سورۂ کہف میں دو دوستوں کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ ایک بہت مال دار تھا، دوسرا نادار، مال دار کو اللہ تعالیٰ نے باغات، نہریں، اور کھیتیاں عطا فرمائی تھیں تو وہ غرور میں مبتلا ہو گیا، اپنے غریب دوست پر برتری جتانے اور قیامت و آخرت کا انکار کرنے لگا تھا، اس کے غریب دوست نے اس کو غرور سے روکا اور بُرے انجام سے ڈرایا مگر وہ اپنے مال و دولت کے گھمنڈ میں بدمست تھا، کچھ نہ سمجھا، ایک دن آسمانی آگ نے اس کے کھیتوں کو کھلیان کر دیا اور باغوں، نہروں کو اُجاڑ کے رکھ دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی اس بدترین مرض سے بہت ڈرایا ہے، پیچھے بھی ہدایت نمبر ۶ اور ۱۳ کے تحت یہ مضمون گذر چکا ہے، ایک حدیث میں ہے:

لا يدخل الجنة احد فى قلبه مثقال حبة من خردل من كبر (مسلم:۱/۹۳)

وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہوگا۔

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فأهل النار كل جعظرى جواظ مستكبر (شعب الایمان:۷۸۲۰)

جہنمی وہ لوگ ہیں جو سخت مزاج، اینٹھنے والے اور تکبر کرنے والے ہیں۔

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بینما رجل یتبختر یمشی فی بر دیه قد اعجبته نفسه فخسف الله به الارض فھو یتجلجل فیھا انی یوم القیمة۔ (مسلم:۲۰۸۸)

ایک شخص دو قیمتی چادریں اوڑھے، اینٹھتے ہوئے جا رہا تھا اور وہ اپنے آپ میں شیخی بگھار رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے اُسے زمین میں دھنسا دیا، اب وہ قیامت تک زمین میں دھنستا ہی رہے گا۔

تمام آیات واحادیث سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غرور واستکبار نہ صرف یہ کہ بندوں کو زیب نہیں دیتا بلکہ اس بدترین صفت کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی نظر سے بھی گر جاتے ہیں بندوں کے نزدیک بھی مبغوض اور ناپسندیدہ ہو جاتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ کبھی اپنے کسی کمال پر نظر کر کے مغرور نہ ہوں، بلکہ نعمت دینے والے کی عطا و مہربانی اور اپنی بے بسی پر نظر کر کے نہایت عجز و نیاز اور بندگی کے ساتھ رہیں، ورنہ جو حشر ابلیس لعین کا ہوا وہی ایک دن ہر مغرور کا بھی ہو سکتا ہے۔ اعاذنا الله منه

۳۹

اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ وہ نیک راہ پر قائم رکھے۔

نیک بننا بھی اللہ کی توفیق پر مبنی ہے اور پھر اس نیکی پر قائم رہنا بھی اسی کے فضل و کرم اور توفیق کا محتاج ہے، اس کو استقامت کہتے ہیں، قرآن وحدیث میں اس بات کی طرف بھی بہت توجہ دلائی گئی ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے خاتمے کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا۔

قرآن کریم میں مرنے کے بعد جنت اور اس کی نعمتوں کا وعدہ ایمان و استقامت پر ہی کیا گیا ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۰﴾

(سورۃ فصلت: ۳۰)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے تو اُن پر بے شک فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اُتریں گے کہ: ''نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو، اور اُس جنت سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

دوسری جگہ ارشا فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۳﴾

(سورۃ الاحقاف: ۱۳)

یقیناً جن لوگوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ: ''ہمارا پروردگار اللہ ہے'' پھر وہ اس پر ثابت قدر ہے، تو اُن پر نہ کوئی خوف طاری ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے مختصر سی نصیحت کرنے کے لئے کہا تو فرمایا:

قل اٰمنت باللّٰہ فاستقم

(مسلم:62)

کہو! میں اللہ پر ایمان لایا اور اس (اقرار) پر جمے رہو

ایک اور موقع پر فرمایا:

خیر الاعمال مادیم وان قل

(بخاری:6462)

بہترین عمل وہ ہے جو پابندی سے ہو اگرچہ تھوڑا ہو۔

معلوم ہوا کہ آدمی جس طرح نیک توفیق کا محتاج ہے اسی طرح آخر تک اس پر قائم رہنے اور خاتمہ بالخیر ہونے کا بھی سخت محتاج ہے، جب ایسا ہے تو اسی سے سمجھ میں آگیا کہ دین پر ثبات واستقامت کی دعا کس اہتمام اور الحاح وزاری سے کرتے رہنا چاہیئے، اسی لئے حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی ان قیمتی اور اہم ترین نصائح کا اختتام دین پر ثبات واستقامت اور خاتمہ بالخیر کے دو اہم اسباب پر فرمایا: ۱؎ نیکوکاری پر مغرور نہ ہونا، ۲؎ دعائے استقامت کا اہتمام رکھنا۔

۴۰

نیک صحبت اختیار کرے۔

بری صحبت سے بچنے کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے، اب نیک صحبت اختیار کرنے کی فضیلت بیان کررہے ہیں، کیوں کہ جس طرح ''بُری صحبت سے آدمی کے اخلاق وعادات خراب ہوجاتے ہیں اسی طرح نیک صحبت کی برکت سے اس کی بُری عادات دور ہوکر نیک صفات اور اچھی عادات کی طرف قلبی میلان ہونے لگتا ہے اور آدمی بہت جلد نیک بن جاتا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (سورۃ التوبۃ:۱۱۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی اس سلسلے میں کئی روایات مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مختلف طریقوں سے نیک صحبت کی اہمیت سمجھائی ہے، ارشاد فرمایا:

قال اللہ وجبت محبتی للمتحابین فیّ والمتجالسین فی والمتباذلین فیّ والمتزاورین فیّ

(المعجم الکبیر للطبرانی:۱۵۰)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میری محبت واجب ہے ان لوگوں کے لئے جو آپس میں میری وجہ سے محبت رکھتے ہیں، میری وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں، میری وجہ سے ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں، اور میری وجہ سے ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں۔

ایک اور موقع پر نیک صحبت کی مثال دیتے ہوئے فرمایا: ''نیک صحبت کی مثال ایسی ہے جیسے عطار کی صحبت کہ آدمی اگر اس کے پاس جائے گا تو یا تو وہ کچھ خوشبو ہدیہ دے گا، یا تم خرید لوگے، یا کم از کم عطر کی خوشبو تو مل ہی جائے گی''۔ (بخاری: ۵۵۳۴)

یہ پوچھے جانے پر کہ صحبت ومجالست کے لئے سب سے اچھا شخص کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ساتھ رہنے اور صحبت اختیار کرنے کے لئے ایسا شخص سب سے اچھا ہے جس کا دیکھنا تمہیں اللہ کی یاد دلائے۔ (درمنثور: ۳/۷/۴)

یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانہ میں علماءِ کرام جہاں کہیں جاتے پہلے جلیسِ صالح کو تلاش کرتے تھے، بخاری شریف کی پہلی حدیث کے راوی حضرت علقمہ رحمہ اللہ جب کوفہ یا بصرہ گئے تو سب سے پہلے مسجد میں جا کر تحیۃ المسجد ادا کی اور یہ دعا کی اللھم ارزقنی جلیسا صالحا اے اللہ! مجھے یہاں کوئی نیک صحبت عطا فرمادے، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مسجد سے باہر نکلتے ہی ایک صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کرادی۔

نیک لوگ وہی ہیں جو خود اتباعِ شریعت وسنت کرتے ہوں، اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرتے ہوں، گناہوں سے سختی سے بچتے اور دور رہتے ہوں اور اپنے پاس آنے والوں کو بھی دین پر چلنے کی دعوت دیتے ہوں اور جن کی معیت وصحبت اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ کرتی اور آخرت کا شوق بڑھاتی ہو۔

خلاصہ آیات واحادیث اور اس پوری تفصیل کا بس یہ ہے کہ ہر مسلمان کو بالخصوص راہِ خدا کے سالکین کو چاہیئے کہ بُری صحبتوں سے دور رہنے کو کافی نہ سمجھیں بلکہ نیک صحبت کا التزام بھی کریں کیوں کہ نیک لوگوں کی صحبت کی برکت سے جس قدر پختہ دین داری حاصل ہوتی ہے کسی اور ذریعہ سے اس قدر حاصل نہیں ہوسکتی۔

آج بتاریخ ۲۸ رشوال المکرم ۱۴۴۱ھ بہ روز اتوار رات ۱۲ بجے اس کتاب کی تکمیل وتصحیح سے فراغت ہوئی۔ حق تعالیٰ شانہ قبول فرمائے۔ آمین